یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

ہماری مطبوعات

نام کتاب	قیمت
ابوبکر صدیق کے سرکاری خطوط	۱۲۵
العلم والعلماء	۱۲۵
اسلام میں غلامی کی حقیقت	۱۲۵
اخلاق اور فلسفۂ اخلاق	۱۲۵
اسلام کا نظام عفت و عصمت	۷۵
آثار و اخبار جلد اول	۱۰۰
المامون	۱۰۰
امام غزالی کا فلسفہ مذہب اخلاق	۱۰۰
انتخاب الترغیب والترہیب (کامل)	۶۰۰
انتخاب الترغیب والترہیب جلد اول	۱۵۰
انتخاب الترغیب والترہیب جلد دوم	۱۵۰
انتخاب الترغیب والترہیب جلد سوم	۱۵۰
انتخاب الترغیب والترہیب جلد چہارم	۱۵۰
الفوز الکبیر اردو	۷۵
ایشیا میں آخری نو آبادیات	۵۰
تاریخی مقالات	۱۲۵
تاریخ مشائخ چشت	۲۵۰
تاریخ گجرات	۱۷۵
تاریخ ادبیات ایران	۲۵۰
تاریخ ہند پر نئی روشنی	۷۵
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	۱۲۵
تاریخ ملت کامل گیارہ جلدیں	۷۶۰
تاریخ ملت جلد اول نبی عربی	۶۰
تاریخ ملت جلد دوم خلافت راشدہ	۹۰
تاریخ ملت جلد سوم خلافت بنی امیہ	۹۰
تاریخ ملت جلد چہارم خلافت ہسپانیہ	۵۰
تاریخ ملت جلد پنجم خلافت عباسیہ اول	۷۵

نام کتاب	قیمت
تاریخ ملت جلد ششم خلافت عباسیہ دوم	۹۰
تاریخ ملت جلد ہفتم تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ	۶۰
تاریخ ملت جلد ہشتم خلافت عثمانیہ	۲۰
تاریخ ملت جلد نہم تاریخ صقلیہ	۵۵
تاریخ ملت جلد دہم سلاطین ہند حصہ اول	۲۵
تاریخ ملت جلد یازدہم سلاطین ہند حصہ دوم	۶۵
ترجمان السنہ کامل (چار جلدیں)	۱۲۰۰
ترجمان السنہ جلد اول	۳۰۰
ترجمان السنہ جلد دوم	۳۰۰
ترجمان السنہ جلد سوم	۳۰۰
ترجمان السنہ جلد چہارم	۳۰۰
حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ	۱۲۵
حضرت عثمان کے سرکاری خطوط	۱۲۵
حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۱۵۰
حیات عبدالحی	۱۵۰
حجاز و ماوراء حجاز جلد اول	۰
حجاز و ماوراء حجاز جلد دوم	۵۰
حضرت عثمان ذوالنورین	۱۵۰
حیات ذاکر حسین	۶۰
خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام	۵۰
خلافت راشدہ کا اقتصادی جائزہ	۵۰
جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد اول	۱۵۰
جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد دوم	۱۵۰
جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد سوم	۱۵۰
جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد چہارم	۱۵۰
جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد پنجم	۱۵۰
جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد ششم	۱۵۰

جلد: ۱۲۶
شمارہ: ۱، ۲
جنوری ر فروری ۲۰۰۰ء

زرِ تعاون
فی پرچہ: ۶ روپے
سالانہ: ۷۲ روپے
رحمن کمپیوٹرس دہلی
Ph.:6952082

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
منیجر ماهنامه برهان
4136-اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 فون نمبر:3262815

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۲۴ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو کٹھمنڈو نیپال کے تربھون ہوائی اڈے پر انڈین ایئر لائنز کے طیارے کو اغوا کر لیا گیا اور اس میں سوار ۱۶۰ر مسافروں کو یرغمال بنا کر ۸ر روز تک انتہائی کسمپرسی کی حالت میں رکھا گیا۔ یہ انسانیت پر شرمناک داغ ہے۔ افسوس ہے کہ جن شیطانوں نے یہ جہاز اغوا کیا وہ اپنے کو مذہب کا پیروکار بھی کہتے ہیں جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے شیطان صفت لوگوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے جن کی ذات سے کسی انسان کو تکلیف پہنچے وہ نہ صرف حیوان بلکہ درندگی کی انتہا تک پہنچے ہوئے خوفناک درندے ہیں جنہیں کسی بھی طرح انسان کہنا انسانیت ہی کی توہین ہے اور انہیں کسی بھی مذہب کا پیروکار بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ نہ وہ مسلمان ہیں، نہ ہندو ہیں، نہ سکھ ہیں اور نہ ہی عیسائی یا کوئی اور مذہبی۔ ان کا کسی بھی مذہب سے تعلق وواسطہ ہی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ وہ صرف شیطان کے پیرو ہیں۔ اور شیطان کا پیروکار نہ تو انسان ہی کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے کسی مذہب کا پیروکار ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ سیاسی داؤں پیچ کے بیچ میں انسانیت ایسی پھنس کر یا دب کر رہ گئی ہے کہ شیطان ہی اپنے کو انسانیت کے زمرہ میں گردانے لگے ہیں۔ انڈین ایئر لائنز کے طیارے کو جس انداز میں اغوا کر کے اس کے مسافروں کو یرغمال بنایا گیا اور اس میں ایک بے گناہ نوجوان مسافر کو اس کی نئی نویلی دلہن کی موجودگی میں قتل کیا گیا وہ شیطانیت کی تمام ہی حدود کو پار کر گیا ہے۔ اپنی چند مانگوں کو منوانے کے لیے ۸ر دن تک بے قصور مسافروں کو اذیت ناک انداز میں قید میں رکھا گیا ہے۔ اس پر ہر انسان دکھی ہے، غم زدہ ہے۔ اور جس نے بھی یہ شرمناک کام کیا ہے وہ ہر لحاظ سے جہنمی ہے، کسی بھی مذہب میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

اس انڈین ائیر لائنز کے طیارے کو اغوا کر کے جس طرح گھما پھرا کر افغانستان کے شہر قندھار کے ہوائی اڈہ پر اتارا گیا اور وہاں سخت سردی کے درمیان میں اس میں مسافر ۸ر روز تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے بلکہ موت سے بھی بدتر حالت میں انہوں نے جس طرح یہ ایام کاٹے ہوں گے یہ تو وہ ہی جان سکتے ہیں جن پر یہ ایام بیتے ہیں ہم تو ان کا تصور ہی کر کے مر رہے ہیں۔ بھوک پیاس، نیز تھکان پیشاب پائخانہ وغیرہ کے بارے سوچ سوچ کر دل بیٹھا جا رہا ہے اور پھر ایک ہی جگہ رہنے پر مجبور ان

مسافروں کے ہاتھ پاؤں ہی اکڑ گئے ہوں گے۔ دنیا میں اگر کوئی سخت سے سخت قانون اگر ہے تو وہ ان اغواکاروں پر لاگو ہو جانا چاہئے۔ جو بھی سخت سے سخت سزا ہو وہ انہیں دیکر انسانیت کی لاج رکھنی چاہئے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر گراہوا یہ شرمناک کام کس ملک نے کیا ہے اور اس نے اس سے کیا حاصل کیا ہے؟ یہ تو سب ہی کے سامنے ظاہر ہو چکا ہے کہ یہ کام کس مقصد سے کیا گیا۔ تین خونخوار مجرموں کو رہا کرانے کے لئے یہ طیارہ اغوا کیا گیا اور یہ خونخوار مجرم کس ملک کے ہیں اور رہا ہو کر کس ملک میں گئے یہ بات بھی صاف ظاہر ہو چکی ہے۔ پڑوسی ملک پاکستان میں ان مجرموں نے اپنی واپسی کی اور وہاں جس طرح ان مجرموں کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا ہے کیا اسے کسی بھی طرح ہم انسانیت اور رافت کے دائرے میں کیا گیا اقدام کہہ سکتے ہیں؟ قطعاً نہیں کارگل میں جس طرح پاکستان نے اپنے فوجیوں کو گھس پیٹھیوں کی صورت میں داخل کر کے خوامخواہ ہندوستان کی سرحد میں گھسنے کی خلاف ورزی کی اور جسے ہندوستان کی بہادر فوج اور ہندوستان کی ہوشمند حکومت کی دانشمندانہ کارروائی نے ناکام کردیا اس سے پاکستان کو عالمی پیمانے پر زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ اسی خفت کا بدلہ لینے کے لئے شاید اسی نے یہ شیطانی اقدام کیا ہے تمام واقعات، حالات کے مدنظر اب اس میں کسی قسم کی ذرا بھی شک کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ اس طیارے کے اغوا میں پاکستان کی نام نہاد مذہبی حکومت کا ہاتھ ہے کیونکہ جس طرح اس طیارے کو پاکستانی حمائتی افغانستان کی طالبان حکومت کے زیر سایہ آٹھ روز تک رکھا گیا۔ طالبان حکومت میں پختون قبیلے کے لوگوں کو فوقیت حاصل ہے پختون قبیلے کے بارے میں افغانستان کے لوگوں کی رائے ہے کہ وہ پاکستان کا پروردہ ہے طالبان حکومت کو افغانستان میں پاکستان ہی کی مدد اور تعاون سے قابض کیا گیا ہے اس لئے یہ کہنا کہ طیارہ کے اغوا میں پاکستان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے ایک دم سے غلط ہے۔ پاکستان ہی اس طیارہ کے اغوا میں پورا پارٹ ادا کر تا رہا ہے۔ یہ بات دنیا کا ہر ملک کہنے پر مجبور ہے اور پھر جو مجرم اس طیارے اور اس میں سوار بے قصور مسافروں کی رہائی کے عوض میں چھوڑے گئے ہیں وہ پاکستان ہی کے شہری ہیں۔ ایک دہشت پسند مولانا اظہر مسعود نے پاکستان جاکر جس طرح ہندوستان کے خلاف زہر اگلا ہے اور اپنی کارروائی سے ہندوستان کے لئے مصیبتیں کھڑی کرنے کا اس نے جس طرح اعلان کیا ہے اور اس کے اعلان پر پاکستان کی حکومت نے کوئی باز پرس نہیں کی ہے اس سے یہ یقین ہو گیا ہے کہ پاکستان کی فوجی حکومت نے یہ طیارہ اغوا کرایا۔ دراصل پاکستان کی بنیاد ہی سامراجی عزائم کے بروئے

کار لانے کے لئے رکھی گئی تھی۔ پاکستان کے قیام سے سامراجی طاقتیں جس طرح کھیل کھیل رہی ہیں اور اس میں انہیں جس طرح کامیابی حاصل ہو رہی ہے اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہی ہوتی ہے کہ عوام کو مذہب کی آڑ میں بیوقوف بنایا گیا ہے پاکستان میں سارے ہی کام مذہب مغائر حرکات پر مشتمل ہیں۔ اسلام کی تعلیمات کی وہاں جس طرح خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں اس سے کس کو انکار ہوگا۔ بے گناہوں کا خون، تشدد اور تشدد پر مبنی تمام کارروائیاں پاکستان کی سرزمین پر ہوتی دیکھ کر اسلام کے شیدائیوں کو جس قدر تکلیف صدمہ اور دکھ ہے اسے لفظوں میں کس طرح بیان کیا جائے۔ اور سب سے زیادہ تکلیف دہ امر تو یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت نے اپنے آپ کو اسلامی حکومت قرار دے رکھا ہے۔ جبکہ اس کا کوئی بھی عمل اسلام سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ پاکستان کی سرزمین پر ہر وہ کام ہو رہا ہے جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف عمل کو جب پاکستان کی حکومت اسلام کے نام سے مشہور کرتی ہے یہ بات اور بھی قابل افسوس اور تکلیف کا باعث ہے کہ ابھی حال ہی میں پاکستان میں ایک سو معصوم بچوں کے قاتل جاوید اقبال کو گرفتار کیا گیا ہے اس مردود نے تقریباً ایک سو بچوں کو مختلف اوقات میں کھیلتے ہوئے پکڑا اور انہیں اپنے کسی مقام پر لیجا کر ان کے ساتھ بدفعلی کر کے انہیں قتل کر دیا اور ان کی لاش کو تیزاب کے ڈرام میں ڈال کر گلا سڑا کر زائل وضائع کر دیا۔ ذرا بتایئے تو سہی اس سے زیادہ اور کیا حیوانیت ہوگی کہ معصوم بچے گھر سے کھیلنے کے لئے نکلیں اور انہیں ایک درندہ کسی بہانے سے بہلا پھسلا کر کہیں لے جائے ان کے ساتھ برا کام کرے اور پھر انہیں مار کر ان کو تیزاب ڈال کر گلا دے۔ ان کے ماں باپ بچوں کو ڈھونڈتے ہوئے رو رو کر پاگل ہو جائیں۔ وہ اپنے بچوں کی آمد کا انتظار ہی کر رہے ہوتے ہیں کہ انہیں ان کی موت کی خبر ملے تو ان پر کس قدر غم کا پہاڑ ٹوٹ گیا ہوگا اس کا خیال و تصور ہی انسانیت کے لئے لرزہ خیزی سے کم نہیں ہے جس معاشرہ میں درندگی اس قدر سرایت کر چکی ہے اس معاشرہ سے اب کسی طرح کی انسانیت کی توقع رکھنا ہی فضول سی بات ہے۔ ہندوستانی طیارہ کو اغوا کر کے اس کے بے قصور مسافروں کو ۸ روز تک جس طرح یرغمال بنائے رکھا گیا اور اس کے ایک نوجوان کو اس کی بیاہتا کے سامنے ہلاک کر دیا گیا۔ اسی طرح ایک سو بچوں کو جس طرح قتل کیا گیا، اس طرح کی درندگی کی خبریں جس معاشرے میں روزانہ سننے کو ملیں گی تو اسے کس طرح ہم کسی بھی زاویۂ نگاہ سے انسانیت کا ادنیٰ سے ادنیٰ نام بھی دینا گوارہ نہیں کریں گے۔ خدا ہی پاکستان کے حکمرانوں کو عقل سلیم عطا کرے گا۔ ہم انسانوں کے بس کی بات ہے ہی نہیں۔

وفیات

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی کی وفات حسرت آیات

یہ کس کو معلوم تھا کہ بیسویں صدی جاتے جاتے بھی امت مسلمہ کو ایسا صدمہ دے جائے گی کہ جس سے امت مسلمہ عرصہ دراز تک ابھر نہ سکے گی۔ عالم دین، مفسر قرآن، مصنف اسلام مدبر و مفکر حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اس عالم فانی سے رخصت ہو کر عالم بقاء میں پہونچ کر مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

ان کے انتقال پر ملال پر تعزیت پورے عالم اسلام میں کی جائے گی۔ اس لئے کہ ان کی شخصیت کے اٹھ جانے سے تمام عالم اسلام کو صدمہ پہونچا ہے، نقصان ہوا ہے۔ ان کی زندگی عالم اسلام کی خدمت کے لئے جیسے وقف تھی۔ انہوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور تصانیف کے ذریعہ عالم اسلام کی سچی راہ نمائی و خدمت کی ہے۔ وہ بے لوث اور مخلص تھے، کسی جاہ و منصب سے بے نیاز صرف دین کی خدمت میں ہی ان کو سکون و اطمینان اور راحت و خوشی حاصل تھی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔ صحیح فکر تھی، سوچ میں سچائی تھی، بلند کردار کے حامل تھے، سادگی رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ کی طرح جوش و جذبہ سے طبیعت بھری ہوئی تھی۔ حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح وسیع النظر تھے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی علمی صحبت و مجلس سے فیض یافتہ تھے۔ مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے کے جاں نثار شیدائی شاگردوں میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ان کے علم و فکر کے معترف و شناسا تھے۔ سیرت پاک پر حضرت مولانا حکیم

صحابہؓ کی تمام خصوصیات واچھائیوں اور خوبیوں کے حامل تھے۔

ان کی وفات سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ انسانیت کی روشنی مدھم ہو گئی ہے کس طرح بتائیں کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے انتقال سے کس قدر غم وصدمہ ہوا ہے ان کی ذات میں کسی بھی قسم کی کمی کا کوئی بھی ذرہ نہ تھا۔

مولانا وحید الدین خاں کے بقول "مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات میں یہ تمام حیثیتیں بہ تمام وکمال جمع ہو گئی تھیں۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ایک بار موصوف کو رجل موہوب" کہا تھا مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے لئے یہ خطاب لفظ بلفظ درست ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا کارنامۂ حیات تقریباً پوری صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک متحرک صدی تھے صدی کی آخری تاریخ کو یہ متحرک شخصیت خاموش ہو گئی۔ وہ انسانیت سے جدا ہو کر اپنے رب سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ان کے اندر بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات موجود تھیں۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا کہ یورپ میں جو کام اکادمی کرتی ہے وہ ہمارے یہاں ایک آدمی کرتا ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس قول کا ایک زندہ نمونہ تھے وہ ایک فرد تھے مگر انہوں نے کئی اداروں کے برابر کام کیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت کو عالم اسلام میں اچھی طرح سمجھا گیا پہچانا گیا خانۂ کعبہ کی چابی ان کو سونپ کر ان کی شخصیت میں یقین واعتماد کا اظہار کیا گیا جو اعزاز بادشاہ وقت کو حاصل تھا وہ اعزاز حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دیکر دنیائے اسلام میں ان کی بے لوث خدمات کو سراہا گیا۔ وہ عربی کے فاضل تھے انگریزی زبان کے ماہر تھے اردو ادب کے مسلمہ ادیب تھے اس کے علاوہ کئی زبانیں انہیں آتی تھیں انکی تصانیف کی تعداد ایک سو کے قریب ہے جن میں بڑی مایہ ناز کتابیں ہیں جنہیں عوام الناس میں سراہا گیا عربی زبان جب بولتے تھے تو عرب کے لوگ حیرت واستعجاب کے عالم میں انہیں دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ عربی میں ان کی تصانیف علوم کا خزانہ ہیں جنہیں عرب لوگ پاکر اپنی خوشیاں نہ چھپاپاتے تھے۔ عربوں کو انہوں نے علم وفن سے مالامال کر دیا جب ہی تو عربوں نے ان کو بڑے بڑے انعام

بکہ اپنے کو خوشی و مسرت سے ہمکنار کیا کنگ فیصل ایوارڈ بروتائی اور عرب امارات کے خصوصی ایوارڈ و یکہ دراصل عرب دنیا نے اپنے آپ ہی کو دنیا میں نمایاں کیا۔ مولانا موصوف کے لئے یہ ایوارڈ صرف خدمت انسانی کے لئے ہی تھے ان کی شخصیت ان ایوارڈ سے بے نیاز رہی ان کی شخصیت سے یہ ایوارڈ جب وابستہ ہوئے تو حقیقت میں ان ایوارڈ کی خصوصیت اہمیت میں نمایاں اضافہ ہی ہوا۔ جب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو رابطہ عالم اسلامی کا رکن ابطہ ادب اسلامی کا صدر اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سینٹر کا صدر بنایا گیا تو دراصل یہ مولانا موصوف کی شخصیت کی نہیں بلکہ انہوں نے خود اپنے اداروں کی حیثیت نمایاں کی۔ اور جس کی وجہ سے انہیں بے پناہ استفادہ حاصل ہوا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے انتقال سے ادارہ ندوۃ المصنفین ذاتی نقصان محسوس کرتا ہے۔ ادارہ کے تمام کاموں سے وقتاً فوقتاً واقفیت حاصل کرتے رہتے تھے ان کے اکثر خطوط میں ادارہ کے سلسلے میں مشورہ ہوتے تھے جو ادارہ کے لئے باعث افتخار ہیں حضرت قبلہ ابا جان مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمتہ اللہ علیہ سے انہیں والہانہ عقیدت و محبت اور انسیت تھی ان کی اولاد سے وہ بڑی محبت کرتے تھے۔ میرے چھوٹے بھائی نجیب الرحمٰن عثمانی کے انتقال پر ان کا گرامی نامہ بطور تعزیت کے وصول ہوا جسے پڑھ کر ہم سب خاندان کے افراد کو بڑی ڈھارس ملی۔ مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی شخصیت و کارناموں پر یک عظیم سیمنار منعقد ہوا جس کی صدارت باوجود انتہائی مصروفیت کے انہوں نے بخوشی قبول کی اور سیمنار میں شروع سے آخر تک موجود رہے اور حضرت مفکر ملت کی خدمات اور ان سے اپنے قریبی تعلقات پر سیر حاصل تقریر فرمائی جو ٹیپ کی گئی اور جسے حاصل سیمنار کہا گیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی انہوں نے جس طرح قیادت کی ہے ہر معاملہ میں چاہے وہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذریعہ چاہے ندوۃ العلماء جیسے دینی اور عالمی شہرت کے مالک ادارے کے ذریعہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے حق ادا کر دیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے یوپی حکومت کے ایک وزیر کی شر انگیزی اور تعلیمی معاملات میں دخل اندازی اور پرائمری اسکولوں میں وندنا سرسوتی جیسی یک مخصوص دعا جو ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے کو لازمی قرار دینے پر جس طرح ہندوستانی

مسلمانوں اور ملک کے سیکولر عوام و لیڈروں کو دکھ و تکلیف پہنچی اور اس پر پورے ہندوستا[ن]
میں ایک عجیب بحران پیدا ہو گیا تھا اس وقت حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ا[س]
طرح پورے ہندوستان کے سیکولر عوام کی رہنمائی کی اس سے حکومت کے ارباب حل و عقد ک[ی]
آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بالآخر حکومت ہند کے وزیر اعظم جناب اٹل بہاری باجپئی
درمیان میں پڑ کر مداخلت کرنی پڑی اور سرسوتی وندنا جیسی متنازعہ پرارتھنا کو اسکولوں میں
پڑھنے کے فیصلے کو واپس لینا پڑا۔ اور صوبائی سرکار کے وزیر تعلیم کو ذلت و خواری نصیب ہوئی
مولانا کے صرف ایک ہی بیان نے فرقہ پرست عناصر کی شر انگیز سیاست کو بساط ہی کو الٹ
کر رکھ دیا۔ بابری مسجد کی تحریک سیاست کے ٹھیکیداروں نے اپنے ہاتھ میں لے کر جس طرح
ہندوستانی مسلمانوں کو نقصان پہنچایا اس سے مولانا کو یقیناً دلی کوفت ہوئی ہو گی۔ کیونکہ بابری
مسجد کی تحریک جس طرح چلائی گئی وہ مولانا کے مزاج سے کوئی مطابقت ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ
اسے دیکھ کر تو مولانا کو ذہنی اذیت ہوتی ہو گی سیاست کے بازی گروں نے اسے اس مقام پر پہنچا
دیا تھا کہ جس سے اس کی واپس ممکن ہی نہیں تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بابری مسجد شہید ہو کر رہی
اور اس طرح تمام دنیا نے ہندوستان کے سیکولرزم کے انہدام کو ان کی روشنی میں ہر جگہ دیکھا
دنیا کے تمام انسان ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔ اور فرقہ پرستوں کی یلغار سے بابری مسجد ک[ی]
شہادت کو نہ بچا سکے۔ بہر حال ہم کہاں چلے گئے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندو[ی]
کے انتقال کے صدمہ نے کچھ ایسی تلخ یادوں کو بھی ابھار دیا ہے جس سے یقیناً اس بین الاقوا[می]
شہرت یافتہ شخصیت کو دکھ ہوا ہو گا۔ حضرت مولانا موصوف معصوم فطرت انسان تھے ان کا دا[من]
صاف تھا جس میں ہر ایک کے لئے محبت تھی انسیت تھی مگر کسی کے لئے نفرت کا شائبہ تک نہ
تھا۔ وہ دنیا سے اس قدر انس رکھتے تھے جس قدر ایک مومن کے لئے دنیا کی ضرورت ہوتی۔
وہ حق پرست تھے دنیا کے ساز و سامان سے ان کا کوئی لگاؤ نہ تھا دنیا ان کے پیچھے پیچھے تھی دنیا کے
اسباب ان کے انتقال کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے مگر وہ ان سے کوسوں دور تھے وہ بوریہ
نشین تھے۔ ان کے گھر میں پکا فرش تک نہ تھا ایک چٹائی پر ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا مگر بڑے بڑے
شاہوں کے محل ان کے آگے ہاتھ باندھے ہر وقت کھڑے رہتے تھے اور وہ اس چاہ میں ہاتھ

ملتے رہ گئے کہ مولانا صرف ان کی طرف ایک نگاہ ہی کر کے کرم فرمادیں۔ لیکن مولانا ان سب سے بے نیاز تھے محلوں کے بیچ میں ان کو اپنا سادہ بوریہ بستر ہی میں محلوں کی شان و شوکت کی خوشبو ملتی تھی۔ انہیں عیش و آرام اور جدید آسائشوں سے سجے دھجے شان و شوکت کے محلوں کے بجائے اپنی سادگی میں راحت واطمینان نصیب تھا ان کی مسرت سادگی کی زندگی میں تھی اور یہ بات موجودہ دنیا میں صرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی ہی کی شخصیت میں پنہاں تھی۔ ایسی ہمہ جہت صفات شخصیت اب ہمارے درمیان میں نہ رہی ہے یہ کس قدر دکھ صدمہ اور اتھاہ غم کی بات ہے۔

اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عالم اسلام کی بیسویں صدی کی سب سے بڑی اور سب سے اہم و بے مثال ہستی تھی جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئی اور جسے بیسویں صدی نے ہی ہم سے چھین بھی لیا اور ہم سب روتے بلکتے ہی رہ گئے۔ ادارہ ندوۃ المصنفین عالم اسلام سے عالم انسانیت سے اس حادثۂ وفات پر اظہار تعزیت کرتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے جہاں میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆

عزیز گرامی قدر اطال اللہ بقا　　　　اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط سے جس کی تاریخ کتابت صاف نہیں پڑھی گئی۔ رفیق گرامی قدر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے صاحبزادہ نجیب الرحمٰن عثمانی کے انتقال کی اطلاع ملی۔ معلوم کر کے افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ اور آپ کے عمر عافیت اور مفتی صاحب کے اخلاف زندگی اور صحت وتوفیق میں برکت دے۔

دعاگو

ابوالحسن علی ندوی

☆☆☆

برادرم عمید الرحمٰن صاحب اسلام علیکم

آپ کے بھائی نجیب الرحمٰن کے انتقال کی خبر جان سوز ہے۔ میرا تعلق آپ کے والد مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم سے ۱۹۵۴ء میں پیدا ہوا۔ وہ میسیج ویکلی (Message Weekly) کے نگراں تھے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما پر نکلا تھا۔ میں اس کا اڈیٹر تھا۔ جب یہ ہفت روزہ بند ہوا تو حکیم عبدالحمید مرحوم نے مجھے دعوت دی کہ میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز قائم کروں۔ مفتی صاحب کو اس کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا ممبر بنایا گیا۔ اس طرح ۱۹۵۴ء سے مفتی صاحب کے آخری دنوں تک میرا آپ کے یہاں برابر آنا رہا۔ مفتی صاحب مجھ سے بڑی محبت فرماتے تھے اور میری باتوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو مفتی صاحب کے خاندان کا ایک فرد سمجھا۔ قدرۃً نجیب الرحمٰن کے چلے جانے کا مجھ پر بہت اثر ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو صبر عطا فرمائے اور مرحوم کو فردوس بریں۔

سوگوار

سید اوصاف علی، ہمدرد نگر، دہلی

☆☆☆

عزیز مکرم ازید مجدکم اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، مزاج شریف

ماہنامہ برہان کا شمارہ ستمبر واکتوبر ملا۔ دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ برسہا برس کے بعد نظر نواز ہوا۔ سب کام چھوڑ کر پڑھنا شروع کیا۔ پہلی نظر میاں نجیب الرحمٰن مرحوم ومغفور کے انتقال پر ملال کی خبر پر پڑی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون بہت صدمہ ہوا۔ مضمون ایک بار نہیں بار بار پڑھا۔ اس وقت بھی میرے سامنے ہے۔ نجیب بھی سامنے کھڑے کہہ رہے ہیں آپ ابا کا انتظار کر رہے ہیں وہ ابھی آرہے ہیں۔ مختصر بولتے تھے اور اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ کبھی کسی سے الجھتے نہیں دیکھا۔ اب سوائے دعا کے کیا کر سکتے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ سب پسماندگان کو صبر جمیل دے۔ آپ کے غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ گھر میں سبکو سلام دعا کہنا۔ گاہ بگاہ خط لکھدیا کرو۔ میں مع متعلقین بخیر ہوں۔ جامعہ مجد

اللہ ترقی پذیر ہے۔

مخلص

محمد ضیاء الحق دہلوی، عزیز آباد، کراچی

☆☆☆

مکرمنا و محترمنا حضرت مولانا عثمانی صاحب مد فیوضہم

کل ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۹ء کا برہان ملا۔ یہ پڑھ کر نہایت رنج وملال ہوا کہ آپ کے برادر خرد نجیب الرحمٰن عثمانی کو موت نے آپ کے خاندان سے چھین لیا۔ اس جانکاہ صدمے سے آپ کا جو حال ہوا اسے میں محسوس کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو صبر جمیل اور مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آپ کے غم میں یہ عاجز بھی شریک ہے۔ بھائی نجیب الرحمٰن عثمانی کے لئے ایصال ثواب کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین، فقط والسلام

مع الاحترام۔ خاکسار

عبدالرؤف خاں، اودئی کلاں (راج)

☆☆☆

کرم گستر محب مخلص مفتی عمید الرحمٰن عثمانی صاحب مدیر "برہان"

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ!

آج "برہان" میں آپ کے بھائی، میرے عزیز دوست اور حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے نجیب الرحمٰن عثمانی کے انتقال پر مضمون پڑھ رہا تھا تو کچھ یادیں میرے ذہن میں بھی تازہ ہو گئیں یہ خط ان ہی یادوں کو حوالۂ قلم کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں لکھنے کے لئے متحرک ہوا ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ کہ نجیب الرحمٰن عثمانی کے انتقال پر ملال سے نہ صرف حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کے چاہنے والوں، ادارہ ندوۃ المصنفین سے وابستہ لوگوں کو صدمہ پہنچا ہے بلکہ سینکڑوں ان کے مخلص دوستوں کی زبردست صدمہ ہوا ہے جو ان کے بہت قریب رہے ہیں اور جنہوں نے ان کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بلا کے ذہین تھے قابلیت میں بھی وہ کسی سے

پیچھے نہ تھے بڑے پڑھے لکھے انسان تھے ملازمت میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے جس سے انہیں کافی اور اونچی تنخواہ ملتی تھی مگر دفتر کے ساتھی کی کسی مذہبی بات سے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اونچی ملازمت کو پائے حقارت سے ٹھوکر ماردی۔ ملّی خوداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی حمیت میں وہ اپنے آباواجداد کے خوگر تھے پنج وقتہ نماز کی پابندی کو کبھی بھی اور کسی بھی لمحہ میں چھوڑنا گوارہ نہیں کیا اسلامی تعلیمات کی خوبیوں کا برملا اظہار کرتے تھے۔ دفتر میں اپنے ساتھی غیر مسلموں کے درمیان میں بیٹھتے تو اسلامی تعلیمات اور دین مذہب کی خوبیاں بیان اس دلنشین انداز میں کرتے کہ سننے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ کھیل کے میدان میں بھی انہوں نے بڑے بڑے نامور کھلاڑیوں سے اپنا لوہا منوالیا تھا کرکٹ کے کھیل میں خصوصی دلچسپی تھی اپنی ٹیم کے کیپٹن تھے ٹیم کے ساتھیوں میں مقبول تھے اس میں سب ہی قسم کے کھلاڑی تھے اور سب ہی ان کی شخصیت کے مطیع تھے اور اسی لئے انہیں ہر کھلاڑی اپنی ٹیم کا کیپٹن بناتا تھا۔ ان میں بلا کی ذہانت تھی ہر مسئلہ پر ان کی رائے ومشورہ صائب تھا ان میں اپنے والد ماجد حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ کی طرح کم گوئی، سادگی متانت وسنجیدگی تھی تصنع وبناوٹ سے کوسوں دور تھے ہر ایک ضرورت مند کی خدمت میں وہ جٹ جاتے تھے علماکرام سے ان کا خصوصی تعلق تھا میرے برادر معظم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سعید صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے بڑی ہی عقیدت رکھتے تھے ان کا دل سے احترام کرتے تھے انہیں جب بھی یاد فرماتے تو عقیدت واحترام سے ان کا نام لیتے۔ جب حضرت مولانا محمد سعید صاحب تائب دہلوی کے مکہ شریف میں حج کے فرائض سے فراغت کرتے ہی انتقال کی خبر دہلی میں پہنچی تو خبر سنتے ہی بے ساختہ رونے لگے اور کہا کہ آج ایک ایسا نیک انسان ہمارے درمیان میں سے اٹھ گیا ہے جو نیکی اور تقویٰ میں امتیازی خصوصیت کا حامل تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بھائی نجیب الرحمٰن عثمانی ہر شخص کو اپنے آئینہ میں دیکھتے تھے ان کی رائے ہر شخص کے بارے میں اچھی تھی ہر ایک کے ساتھ ان کا حسن ظن کا معاملہ تھا۔ بڑوں کی عزت اور چھوٹوں کے ساتھ حسن سلوک ان کا شعار تھا۔ اخلاق محبت شرافت عمل وکردار سے لیس الفاظوں میں ان کی زندگی متحرک تھی۔

میں نے ان کو ذاتی طور پر بہت قریب سے دیکھا ہے اور میں نے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کے خیالات بھی سنے اور سمجھے ہیں جس کے پیش نظر میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو ان سے بڑی محبت تھی اور وہ ندوۃ المصنفین کے لئے مفتی عمید الرحمٰن عثمانی

کے ساتھ مفتی نجیب الرحمٰن عثمانی کو منتخب کئے ہوئے تھے ان کی خواہش اور رائے تھی کہ یہ دونوں بھائی آپس میں محبت وپیار سے مل جل کر ندوۃ المصنفین کو ترقی وعروج پر قائم ودائم رکھیں گے۔ اور یہ بات مفتی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد صحیح ثابت ہوئی کہ مفتی عمید الرحمٰن عثمانی اور نجیب الرحمٰن عثمانی دونوں بھائیوں میں ضرب المثل محبت تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مفتی نجیب الرحمٰن عثمانی کی مغفرت فرما کر انہیں اپنی جوار رحمت میں خصوصی جگہ عنایت فرمائے اور متعلقین کو ان کی بیوہ کو اور ان کے بھائی بہنوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

محمود سعید بلالی دہلوی

برادرم جناب عمید الرحمٰن صاحب عثمانی السلام علیکم

آج یہ معلوم کر کہ برادرم عزیزی میاں نجیب الرحمٰن عثمانی اس دار فانی سے کوچ کر گئے بحکم ربی انا لله وانااليه راجعون پروردگار عالم مرحوم کی مغفرت فرما کر جنت النعیم میں جگہ عطا فرماوے آمین۔ ان کی اہلیہ و خصوصاً آپ کو اور جملہ متعلقین کو صبر کی توفیق عطا فرماوے آمین ثم آمین ان کی دائمی آرام گاہ کو نور سے منور فرماوے آمین۔ مرحوم میں بہت خوبیاں تھیں حقیقت میں مفتی صاحب مرحوم کے صاحبزادہ تھے بڑی محبت وخلوص کے انسان تھے جب بھی ملاقات ہوئی بہت ہی خلوص سے پیش آتے تھے۔ مفتی صاحب مرحوم کے متعلقین کا اس انداز سے خیال کرتے تھے جیسا انہوں نے اپنے والد محترم حضرت مفتی صاحب مرحوم ومغفور کو دیکھا تھا حضرت مفتی صاحب مرحوم بہت محبت فرماتے تھے میں جب بھی دہلی جاتا مفتی صاحب مرحوم کے پاس ضرور جاتا تھا پروردگار عالم مرحوم کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے صدقہ طفیل میں مغفرت فرما کر جنت النعیم میں جگہ عطا فرماوے اللہ تعالیٰ آپ کو وہمشیرہ کو اہلیہ کو صبر جمیل عطا فرماوے آمین آج کل میرے بھی پیر میں تکلیف چل رہی ہے چلنا مشکل ہو رہا ہے۔

شریک غم : جمیل الدین صابری

لال کرتی میرٹھ

☆☆☆

محترم المقام ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "برہان"

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آج کی ڈاک میں ماہنامہ برہان کا ستمبر واکتوبر ۱۹۹۹ء کا مشترکہ شمارہ موصول ہوا۔ صفحہ ۵ پر آہ! میرا چھوٹا بھائی عنوان سے آں محترم کا مضمون پڑھ کر آنکھیں ڈبڈبا اٹھیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم بھائی کی بال بال مغفرت فرمائے اور آپ سبھی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ میری جانب سے تعزیت پیش ہے۔ افسوس آپ کے رسالہ برہان کے ذریعہ ہی مرحوم کی اطلاع ملی اس سے پہلے مجھے خبر نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

عارف علی انصاری

ناظم خدیجہ لائبریری، خیر آباد، سیتاپور، یوپی

گرامی قدر قبلہ عثمانی صاحب! سلام مسنون

امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے احقر بخیر ہے ماہنامہ "برہان" مستقل پابندی سے موصول ہورہا ہے جو آپ کی کرم گستری اور بندہ نوازی کا بین ثبوت ہے۔ ستمبر واکتوبر کے برہان میں آپ کے برادر خورد نجیب الرحمٰن عثمانی کے انتقال پرملال کی روح فرسا خبر پڑھ کر قلبی صدمہ ہوا۔ اس حادثہ جانکاہ پر جتنا بھی اظہار رنج وغم کیا جائے کم ہے لیکن اس سب کے باوجود آخیر میں صبر ہی کرنا پڑتا ہے اور صبر کرنے کے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑے درجات وثمرات ہیں۔

حق تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ مرحوم کو غریق رحمت کرے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ کافی عرصہ سے میرا دہلی آنا نہیں ہوا ورنہ ضرور حاضر خدمت ہوتا۔ خط وکتابت کا سلسلہ کئی بار شروع ہو کر منقطع ہو گیا ہے۔ نہ جانے کس طرف سے تساہلی وتغافل درمیان میں حارج ہو جاتا ہے۔

بہر کیف یہ سلسلہ اگر میرے آپ کے درمیان قائم رہے تو ایک دوسرے کی خیر وعافیت تو معلوم ہو جایا کرے۔ اللہ پاک اس سلسلے میں دوام واستحکام عطا فرمائے۔

محترم فخر الدین بھائی کو میرا سلام عرض کردیں اور مزاج پرسی بھی بقیہ جملہ احباب وپرسان حال کی خدمت میں علیٰ قدر المراتب سلام مسنون اور دلی دعائیں پیش کردیجئے۔ دہلی جب بھی آنا ہوا انشاء اللہ حاضر خدمت ہو کر شرف نیاز حاصل کروں گا اور اظہار تعزیت بھی دعائے خیر میں برابر

یاد رکھا کیجئے۔ اچھا خدا حافظ

نیاز آگیں: شعیب انجم، بگراسی. بلند شہر

☆☆☆

مکرمی تسلیم

تازہ "برہان کے ذریعہ آپ کے برادر خورد کے انتقال پر ملال کی اطلاع ملی، افسوس ہوا۔ آپ نے اپنے ماہنامہ میں مرحوم کی جن خوبیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے وہ واقعی مقدر والوں کے نصیب میں ہی ہوتی ہے۔

میں اس موقعہ پر آپ کی اور جملہ متعلقین کی خدمت میں اظہار تعزیت کرتا ہوں اور خدا تعالیٰ کے حضور میں دعا کرتا ہوں کہ وہ مرحوم کے درجات بلند فرمائیں اور آپ کو اور جملہ متعلقین کو خصوصاً ان کی بیوہ اور بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

شریک غم: شمس الدین صدیقی

☆☆

بھائی عمید الرحمٰن عثمانی　　　اسلام علیکم

اللہ کرے آپ بخیریت تمام ہوں آپ کا خط ملا۔ بھائی کے انتقال پر ملال کی اطلاع ملی۔ اللہ پاک مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے آمین۔

میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں خداوند تعالیٰ آپ کو صبر عطا کرے۔ میری گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے خط لکھنے میں دیر ہوئی کچھ خیال نہ کریں۔ اپنے گھر والوں کو صبر کی تلقین کریں۔ اور میری جانب سے سانحہ کیلئے ہمدردی کا اظہار کریں۔ سلام و دعا بھی کہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو آگاہ کریں بقیہ حالات بدستور ہیں۔ قبلہ حکیم صاحب اور عرفان بھائی و حاجی منظور علی صاحبان بخیر ہیں۔ فقط والسلام

آپ کا بھائی
محمد خلیل کلکتہ۔۷

☆☆☆

بھائی نجیب الرحمٰن صاحب (مرحوم ہوگئے)

بڑے دکھ کے ساتھ لکھنا پڑرہا ہے کہ بھائی نجیب الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوگیا۔ مجھے ان کے بھائی عمید الرحمٰن عثمانی نے فون پر خبر کی۔ مجھے ایک دم دھکا سا لگا اور بہت ہی صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کیونکہ نجیب الرحمٰن عثمانی بہت ہی باصلاحیت، نفاست پسند، دیندار، صوم وصلوٰۃ کے پابند، سارے گھر کے لاڈلے، بیوی کے لئے اچھے شوہر تھے۔ میری اکثر گھر پر بھی اور قبرستان مہندیوں میں بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

نجیب الرحمٰن عثمانی شاہ ولی اللہ کے مزار پر اور اپنے والد حضرت مفتی عتیق الرحمٰن کے مزار پر فاتحہ وغیرہ پڑھنے جاتے تھے۔ میرے بھی والد، والدہ وہاں مدفون ہیں۔ میں بھی حاضری دیتا۔ فاتحہ وغیرہ کے لئے جاتا تو میری وہاں پر اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ نجیب الرحمٰن کی شادی حضرت مفتی شوکت علی فہمی کی دختر سے ہوئی تھی۔ ان کی ایک صاحبزادی محمد سلیم ولد محمد شفیع مجسٹریٹ (مرحوم) سے ہوئی۔ تقریبا تین سال میں محمد سلیم بھی وفات پاگئے۔ بیچاری وہ بھی بیوہ ہوگئیں۔ ان کے دو بچے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بیواؤں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کے خاوندوں کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

ہمارے بھائی عمید الرحمٰن عثمانی اور ان کے سب گھر والے بہت ہی رنج وغم میں مبتلا ہیں لیکن بھائی عمید الرحمٰن عثمانی بہت زیادہ اپنے دل ودماغ پر اثر لئے ہوئے ہیں۔ میں نے حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کسی کا کوئی مرتا ہے تو صدمہ تو ہوتا ہی ہے لیکن اگر ابتداء ہی سے صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا نعم البدل عطا فرماتے ہیں۔ آگے فرمایا کچھ دنوں میں تو آہستہ آہستہ صبر آہی جاتا ہے۔ میرا حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ اور گھر کے سب ہی افراد سے بہت قریبی تعلق رہتا ہے۔ میں بھی دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے اور نجیب الرحمٰن عثمانی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین فقط

دعا گو: رفیع الدین، چوڑی والان، دہلی۔۶

محترم جناب مفتی عمید الرحمٰن صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قبلہ مفتی شوکت علی فہمی کے گھر سے فون پر اطلاع ملی کہ آپ کے برادر عزیز محترم نجیب الرحمٰن صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون آپ کے خاندان بالخصوص حضرت مفتی صاحب سے ہمارے خاندان خاص طور پر مفسر قرآن حضرت میر واعظ محمد یوسف شاہ صاحبؒ اور ابا حضور حضرت شہید ملت میر واعظ مولوی محمد فاروق صاحبؒ کے جو گہرے اور دیرینہ علمی فکری دینی اور ادبی رشتے اور تعلقات تھے اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔

میں ذاتی طور پر اس سانحہ سے دکھی ہوں اور آپ کے پورے خاندان اور مرحوم کی اہلیہ کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہوں دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔ اور آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔

جامع مسجد سری نگر میں مرحوم کی مغفرت کے لئے ایصال وثواب کا بھی اہتمام کیا گیا۔

والسلام

دعاگو، محمد عمر فاروق میر واعظ، کشمیر

☆☆

جناب محترم مفتی صاحب

سلام مسنون نیاز دروں

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے؟ بھائی نجیب الرحمٰن کے انتقال پر ملال کی خبر سنکر بے حد دکھ ہوا۔ ابھی تو وہ جوان سال، جواں عمر اور جواں فکر تھے۔ مگر افسوس موت کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں جوانی میں ہی ہم سے چھین لیا۔

مرحوم کے انتقال سے آپ کے خانوادہ پر کیا بیت رہی ہوگی۔ میں خود بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ مگر تقدیر الٰہی کے سامنے چارہ کار بھی کیا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔　　والسلام

ناچیز محمد سعید الرحمٰن شمس

مدیر نصرۃ الاسلام

☆☆

از مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط
اڈیٹر اخبار ''زمزم''

قسط ۲

اسلام اور سائنس

کتب مقدسہ اور سائنس: یہی بشپ گور سائنس کے مقابلہ پر مسیحیت اور کتب مقدسہ کی حمایت کرتے کرتے اس قدر آگے بڑھے کہ تمام بائبل کو مشکوک اور غیر قابلِ اعتبار قرار دے دیا فرماتے ہیں۔

''حقیقت یہ ہے کہ کتاب پیدائش کے ابتدائی ابواب جس میں تخلیق کائنات، انسانی پیدائش، ہبوط، داستان عدن وطوفان مذکور ہے، تاریخی ریکارڈ کی حیثیت نہیں رکھتے، وہ تو محض الہامی افسانے ہیں جن کا مآخذ بنی اسرائیلی روایات ہیں۔ کتاب پیدائش کے علاوہ کتاب سموئیل، عزراہ، سلاطین، نحمیاہ اور کتاب اعداد میں جو کچھ بھی بیان ہوا ہے ان کا بیشتر حصہ محض خیالی ہے۔ ان میں ان لوگوں کے خیالات اور نقطہ نظر کی آمیزش ہے جن کی طرف یہ کتابیں منسوب ہیں علاوہ ازیں عہد عتیق میں ہر قسم کا لٹریچر پایا جاتا ہے اور ان کا بیشتر حصہ ایسے حضرات کا لکھا ہوا ہے جن کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ کون تھے۔ ان میں وہ حصے بھی شامل ہیں جو انبیا کے بعد نامعلوم اشخاص کی وساطت سے داخل کئے گئے۔''[1]

سائنس کی اس سے بڑھ کر اور کیا فتح ہوگی کہ جن الہامی نوشتوں کی آڑ لے کر علماء اور حکماء کو زندہ جلایا گیا تھا انہیں ارکان کلیسا نے خود جعلی، خیالی، تمثیلی غیر واقعی اور غیر تاریخی تسلیم کر لیا، جلنے والے جل کر راکھ ہو گئے مگر ان کے نظریات نے بقا کی دولت حاصل کر کے ایسا بدلہ لیا کہ خود رجال مذہب نے اپنی کتابوں کو آگ لگا دی اور اکتشافات کے سامنے احترام کے لئے گردن جھکا دی!

---

[1] بشپ گور صفحہ ۱۶۰ Belief in God

اگر سائنس "مذہب" کی ان قلابازیوں پر قہقہہ لگائے تو حیرت کی کون سی بات ہے؟ چنانچہ مشہور سائنس داں وائٹ ہیڈ کو کہنا پڑا۔

"دو سو سال تک "مذہب" سائنس کے مقابلہ پر ڈٹا رہا اور اس کی مدافعت میں کھڑا رہا اگرچہ مدافعت بہت ہی کمزور اور غیر قابل اعتنا تھی۔ اسی دوران میں علم و تحقیقات کا سلسلہ بھی جاری رہا اور نئے نئے حالات پیدا ہوتے رہے مگر مذہب کی طرف سے نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی گئی اور ان میں یا تغیر و تبدل کیا گیا یا ان کی تشریح ایسی کی گئی جس سے مذہب کا دامن کسی حد تک بچا رہا۔ اس کے بعد جب حامیان مذہب کی جدید نسل پیدا ہوئی تو اس نے مذہب میں تغیر و تبدل کا خیر مقدم کیا۔ اس مسلسل رجعت اور پسپائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے مفکرین مذہب کی علمی مرجعیت و مقبولیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔" [۱]

عیسائیت پر دوسرا مرحلہ: عیسائیت پر پہلا حملہ سائنس نے کیا اور اسے کھلے میدان میں شکست دی دوسرا حملہ عیسائیت کے تن نیم جان پر ریسرچ اور تحقیقات کی طرف سے ہوا اور اس حملہ نے "مذہب" کی جان تک نکال ڈالی۔ پہلے حملہ میں مسیحیت کی پوزیشن کچھ جارحانہ اور کچھ مدافعانہ تھی۔ مگر اس دوسرے حملہ میں اس کا ایسا محاصرہ ہوا کہ وہ دفاع و حفاظت کے سوا اور کچھ نہ کر سکی اور تحقیقات کی گولہ باری نے اس کا قلعہ بالکل ہی مسمار کر ڈالا۔

اس حملہ میں علماء اور محققین کی جماعت نے کتب مقدسہ کے ایک ایک حرف پر نظر ڈال کر داخلی شہادتیں فراہم کیں۔ ان کی ادبیات پر غیر جانبداری کے ساتھ بحث کی۔ ان کی روایات کی چھان بین کر کے ان کا رعب دلوں سے زائل کیا۔ ان کے مصنفین کا پتہ لگایا۔ ان کا زمانہ تصنیف معلوم کیا اور جائزہ لینے کے بعد علماء ہی کو نہیں بلکہ علم و دانش تحقیق و بصیرت کو فیصلہ کرنا پڑا کہ کتب مقدسہ، عہد عتیق و جدید، الہامی تو کجا تاریخی حیثیت سے بھی نا قابل استناد اور ساقط الاعتبار ہیں۔

ان حملہ آوروں میں نمایاں امتیاز ڈاوڈ سٹراس (Dayid Strauss) کو حاصل ہے۔ اس نے ۱۸۳۵ء میں کتاب "حیات مسیح" لکھ کر تمام کلیسا کو دعوت فکر دی۔ اور ایک ایسی جماعت پیدا

[۱] Ssienca & The Modernworld صفحہ ۲۱۸

کردی جس نے کلیسا کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔اسٹر اس کے بعد اور ڈاردن کی کتاب "اصل الانواع" کی اشاعت سے کچھ ہی پہلے جرمن محقق رینان (Renan) نے "حیات مسیح" لکھ کر عہد جدید پر تاریخی اور علمی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی اور پھر ۱۸۳۱ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان فرڈی نڈ بور (Frdinand Bour) نے عہد جدید کی ادبیات پر ایسی سخت اور شدید نکتہ چینی کی کہ یورپ کا علمی اور ادبی طبقہ مسیحیت سے یکسر منحرف ہو گیا۔ اور کلیسا آج تک اس عظیم نقصان کی تلافی نہ کر سکی۔

ان کے بعد جرمنی کے ایک اور عالم البرٹ سوئزر (Albert Schweitzer) نے ایک بلند پایہ اور جامع کتاب[1] لکھی۔ جس کی نسبت علماء و محققین کی متفقہ رائے ہے کہ مسیحیت اور اس کے سرچشمہ کے متعلق آج تک ایسی محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ ۱۹۰۱ء میں عبرانی ادبیات کے ماہر ریڈ (W r e d e) نے بھی اس طرز کی کتاب[2] شائع کی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر گلوور (Glouer) ڈاکٹر رشڈل (Rashdall) اور ڈاکٹر کرسوپ لیک (Kirsopp Lake) نے قلم اٹھایا اور کتب مقدسہ اور مسیحی روایات کے نیچے ایسا ڈائنا بچھا دیا جس نے مسیحیت کی شانِ تقدس کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔

تیسرا حملہ: سائنس نے عیسائیت پر جو تیسرا حملہ کیا وہ پہلے دو حملوں سے زیادہ سخت اور کامیاب ثابت ہوا۔ مطالعہ تقابل مذاہب (Comperative Study Of Religions) نے یہ حقیقت آفتاب کی طرح واضح اور روشن کردی کہ عیسائیت کے اصول و عقائد، نظریات و خیالات تمام تر قدیم خرافیات اور بت پرست اقوام کے رسم و رواج سے ماخوذ ہیں۔ بائبل کا قانون اخلاق قانون تعزیر، قانون معیشت و معاشرت اور قانون سیاست کا سرچشمہ اشوری اور حمورابی قوانین ہیں۔[3] ان قوانین میں بہت سی دفعات مہذب اور قابل قبول ہیں اور بہت سی ناقابل تسلیم اور ناقابل عمل! مسیحی عقائد و نظریات از اول تا آخر بت پرست قوموں کے قدیم

---

[1] اس کتاب کا نام یہ ہے "The Guest Of The Histarical Jems

[2] یعنی "Meroianie Secretin The Gospels"

[3] کلیرک ایڈورڈ The World S. Earliest Law صفحہ ۱۱۴ تا ۱۳۲

سرمایہ سے ماخوذ ہیں اور عہد بہ عہد ان میں ترمیم و تنسیخ ہوتی جارہی ہے۔

مقابلہ مذاہب کی سائنس پر سب سے پہلے میکس مولر نے توجہ دی اور اس علم کو مستقل بنا کر کتب مقدسہ کو اس کی روشنی میں جانچا اور پرکھا، میکس مولر نے انتہائی تحقیق کے ساتھ یہ دریافت کیا کہ مختلف زمانوں میں مختلف سنوں اور قوموں میں کیا کیا رسم ورواج، عادات اور خیالات موجود تھے۔ اس علم کی بدولت مصر قدیم، بابل، اشور، ہندوستان، افریقہ کے مخفی خزانوں کا پتہ لگایا گیا اور ماہرین آثار قدیمہ نے زمینیں کھود کھود وہ آثار واطلال اور وہ کتبے اور نقشے برآمد کئے جن سے مسیحی عقائد وخیالات کی حقیقت کھل گئی اور دنیا کو تسلیم کرلینا پڑا کہ خدا کے اکلوتے فرزند کا انسانی شکل میں ظاہر ہونا۔ اس کا کنواری عورت کے بطن سے پیدا ہونا۔ مخلوق کے گناہوں کی خاطر اس کا مصلوب ہونا۔ مصلوب ہونے کے بعد اس پر عورتوں کا نوحہ کرنا۔ تیسرے روز قبر میں سے جی اٹھنا شراب اور روٹی کی شکل میں اس کے گوشت اور خون کا بطور یادگار باقی رہنا اور ایسٹر اور کرسمس ڈے کی طرح ہر سال اس کی زندگی اور موت کی تقریب منانا۔ تمام تر قدیم خرافات اور بت پرستانہ عقائد سے ماخوذ ہیں۔

میکس مولر کے بعد جے۔جی فریزر (Frazer) نے مشہور کتاب [1] لکھ کر مطالعہ مذاہب کی سائنس کو پائدار بنیادوں پر قائم کردیا جس کے بعد نہ صرف یورپ کے پڑھے لکھے امراء کی بلکہ کلیسا کے مقدس ارکان اور رجال مذہب کی آنکھیں کھل گئیں اور کلیسا نے اس کے مقابلہ میں ایسی شکست کھائی کہ آج تک اس کے ارتجاعی عمل کا تصور نہ کرسکی۔ مطالعہ مذہب کی سائنس نے اب یہ بات عام طور پر ثابت کردی ہے کہ عیسائیت کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ سب مشرکانہ اور پرستانہ خیالات کا مجموعہ ہے جو قدیم اقوام سے وراثتاً اسے ملا ہے [2]

یہ موضوع جس قدر اہم اور دلچسپ ہے اسی قدر وسیع بھی ہے ہم ناظرین کرام سے سفارش کریں گے کہ وہ پوری بصیرت حاصل کرنے کے لئے محققین کی تحقیقات کی طرف رجوع کریں۔ [3]

---

[1] جے۔جی فریزر (A Sudyin The History Of Oriental Religion

[2] مطالعہ مذاہب کی جس سائنس نے عیسائیت کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینکا اسی سائنس نے اسلام کی صداقت پر مہر بھی لگادی! مدت کی تحقیقات اور چھان بین کے بعد محققین کو پتہ لگا کہ مسیحیت کا سرچشمہ کہاں ہے مگر قرآن کریم نے تیرہ سو سال پہلے اعلان کردیا تھا کہ یضاھون قول الذین کفروا من قبل (نصاریٰ تو اپنے سے پہلے کفار کی نقل کررہے ہیں!) گویا قرآن کریم ہر زمانہ میں سائنس اور تحقیقات سے آگے ہی نظر آتا ہے۔ منہ ۱۲

[3] مثلاً جے۔ایم رابرٹسن کی کتاب "Pagan Chrats" یا دیویلمین کی کتاب (Progressive Revelation) اور فریزر کی ضخیم مذکورہ کتاب منہ ۱۲

(چوتھی قسط)

فن

تاریخ گوئی کی ابتداء

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں ڈبل ایم ، اے .پی، ایچ، ڈی (لیکچرر)
انٹر کالج اٹاوہ ضلع کوٹہ (راجستھان)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے علاوہ مذکورہ تعریف ہائے تاریخ میں بعض کا اطلاق صرف مادۂ تاریخ پر ہوتا ہے اور بعض میں امورِ عظام وشہور کی قید عائد کی گئی ہے۔ اگر چہ یہ درست ہے کہ عظیم واقعات اور مشاہیر کی ولادت ورحلت وغیرہ کی تاریخیں ہی بالعموم یاد رکھی جاتی ہیں، تاہم ایسی تعریف ہائے تاریخ کو ہم مکمل نہیں کہہ سکتے کیونکہ فن تاریخ گوئی کے لٹریچر میں معمولی نوعیت کے واقعات کی تاریخیں بھی اساتذہ فن نے بر آمد کی ہیں جس کے سبب ان غیر اہم واقعات کو بھی تاریخی (Historical) اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ خواہ ایسی تاریخیں تفنن طبع ومہارت فن اور استادانہ کمال دکھانے کے لئے ہی کہی گئی ہوں۔ دراصل اس فن کی آفاقیت اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ کائنات میں رونما ہونے والے حوادث وسانحات میں ایسا کوئی واقعہ حادثہ اور سانحہ ایسا نہیں جس کے لئے تاریخ گوئی کے دامن میں گنجائش نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ ولادت وار تحال، تقاریب ختنہ وعقیقہ، تسمیہ خوانی، حفظ قرآن وشادی اور فراغت تعلیم، تقرریٔ ملازمت، ترقی ومعزولی ملازمت، خطاب یابی وبیماری وغسل صحت، رسیدات وصولیابی تحائف تعمیر عمارات، شروعات تجارت، کتابوں کی تصنیف وتالیف کی طباعت واشاعت، بادشاہوں کی تخت نشینی، فتوحات اور شکست وہزیمت میدان جنگ سے فرار اور قدرتی حوادث وغیرہ یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں مہد سے لحد تک رونما ہونے والے اہم وغیر اہم واقعات کی تاریخیں اساتذہ نے بر محل موزوں کی ہیں۔ چنانچہ ان امور کے پیش نظر تعریف تاریخ یہ ہوگی: ”جس فن کے ذریعہ بلا تخصیص امور عظام انسانی زندگی میں وقوع پذیر

ہونے والے چھوٹے بڑے ہر قسم کے واقعات کے سالہائے مسنوح کسی حرف یا حروف، لفظ یا الفاظ یا عبارت منثور یا منظوم میں بحساب جمل مکتوبی حروف کے اعتبار سے رائج الوقت سنین میں محفوظ کر دیے جائیں اسے اصلاحاً تاریخ یا تاریخ گوئی کہا جا سکتا ہے۔"

موجد تاریخ گوئی: حروف ابجد کی ترتیب کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کی ایجاد کے بارے میں اختلاف رائے ہے اس لئے حساب جمل اور تاریخ گوئی کے موجد کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا کہ اس فن کا موجد کون تھا اور وہ کہاں کا باشندہ یا کس عہد کی شخصیت تھا۔ اس بات کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس نے کلمات ابجد کو تاریخ گوئی کے لئے استعمال کرنے کا تصور کہاں سے لیا۔ ابو ریحان البیرونی (م ۱۰۲۸ء) نے بھی اپنی تصانیف علم جفر[۱] و نجوم میں حساب جمل کے موجد کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا جبکہ وہ خود علم جفر کا استاد کامل تھا۔ لہٰذا غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ فن تاریخ گوئی انسانی فطرت کے اس بنیادی تقاضہ کی تحریک ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتا ہے اور کوئی یاد ایسی چھوڑ دینا چاہتا ہے کہ لوگ اسے یاد رکھیں اور تاریخ کے اوراق پارینہ میں اس کا نام ثبت رہے۔ اسی نفسیاتی سبب سے ممکن ہے کہ اس فن کی ایجاد کی گئی ہو تاکہ اس کے ذریعہ اس کے کارنامے تاریخ کا حصہ بن جائیں اور لوگوں کی زبانوں پر رہیں۔ بہر حال ہمیں اس کے موجد کی ذہانت کی داد ضرور دینی چاہئے۔[۲]

مادۂ تاریخ: تاریخ گوئی کے تعلق سے "مادۂ تاریخ" کے بارے میں غور کرنا بھی ضروری ہے۔ لغت میں "مادہ" بتشدید دال ہر چیز کی اصل اور ہر شے کے سامان ترکیب کو کہتے ہیں جو دوسری شے بنانے کے لئے ہوتا ہے۔[۳] فن تاریخ گوئی میں وہ حرف، حروف، لفظ، الفاظ یا فقرہ یا مصرع مادہ کہلاتا ہے جس کے حروف کی عددی قیمت کا بحساب ابجد میزان کرنے پر کسی واقعہ کا سنہ مقصود بر آمد ہو جائے۔ بقول ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب نظر "وہ عدد یا اعداد کا مجموعہ (برائے صوری تاریخ) اور حروف یا کلمات یا ان کا مجموعہ جس سے (بحساب جمل) تاریخ

۱۔ ایک علم کا نام جو حروف تہجی سے متعلق ہے جس کے قاعدے سے غیب کی خبر معلوم ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس علم کے موجد امام جعفر صادقؒ ہیں۔

۲۔ صنادید تاریخ گوئی، مشمولہ مجلہ دانش ویژہ (خاص) نامہ نمبر ۵ تا ۷ صفحہ ۲۲۴، اسلام آباد (پاکستان)

۳۔ "مادہ بتشدید اصل ہر چیز و سامان ترکیب ہر شے کہ مدد باشد برائے غیرے" رک غیاث اللغات صفحہ ۳۹۴

کا اظہار ہو "مادۂ تاریخ" کہا جائے گا۔[۱] اسے اردو میں رمز یا مادہ اور ترکی میں تاریخ کہتے ہیں۔[۲] مادۂ تاریخ نثر و نظم دونوں میں ہو سکتا ہے، مگر خوبی مادہ یہ ہے کہ وہ دلچسپ اور واقعہ کا مشعر ہو، معمے کی طرح دشوار اور پیچیدہ نہ ہو بلکہ آسان، بے تکلف، حشو و زوائد سے پاک اور بدیہہ گوئی کا نمونہ ہو۔ بقول پروفیسر سید حنیف نقوی:

"مادۂ تاریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ تصور کی جاتی ہے کہ وہ جس خاص واقعے سے تعلق رکھتا ہو اس کا پوری طرح عکاس ہو[~] اور اس کے علاوہ اسی قسم کے کسی دوسرے واقعے پر اس کا انطباق نہ کیا جا سکے۔ ولادت وفات یا اسی قسم کے دوسرے موقع پر کہی جانے والی وہ تاریخیں جو کسی ایک سال کے اندر پیش آنے والے اپنی نوعیت کے تمام واقعات کے لئے یکساں طور پر موزوں اور مناسب ہوں کسی ندرت کی حامل نہیں ہوتیں۔ بطور مثال سید مسعود حسن مسعودؔ کی یہ تاریخ دیکھئے:

یکا یک یہ <u>مسعود آئی ندا</u> لکھ دو سال وفات (عندلیب تواریخ، صفحہ: ۲۰۵) تاریخ (مادہ) کا
۱۳۵۶ھ

دوسرا قابل لحاظ حسن یہ ہے کہ وہ حشو و زوائد سے پاک اور تعمیہ (تدخلہ) و تخرجہ کے عیوب سے مبرا ہونا چاہئے۔[۳]

تاریخ گوئی میں دشوار ترین اور دماغ سوز عمل کسی ایسے لفظ یا فقرہ یعنی مادہ کی تلاش ہے جس کے مکتوبی حروف کی قیمتوں کو بحساب جمل شمار کرنے پر ایک مقررہ عدد حاصل ہو جائے۔ مادہ بر آمد کرنے کے اس دشوار گزار مرحلہ کے پیش نظر ہی تاریخ گوئی کے مسلم الثبوت استاد محمد علی جویا کا قول ہے کہ "تاریخ گوئی نفس سخن ہے اور مادہ گفتار مگر نہایت دشوار، ع "تارنج برنیاید تاریخ برنیاید" یعنی تاوقتیکہ رنج برنیاید تاریخ برنیاید"[۴] (جب تک محنت و تکلیف نہ اٹھائی جائے تاریخ نہیں ہوتی۔)

عربی و فارسی کی طرح اردو میں بھی مادہ تاریخ بر آمد کرنا زبردست چیلنج، ذہنی کاوش،

---

[۱] صنادید تاریخ گوئی، صفحہ ۲۱۱ تا ۲۲۶

[۲] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ۸: ۱۷۵ لاہور

[~] مثلاً حالیؔ کی تاریخ وفات پر مولانا صفیؔ لکھنوی کا یہ تاریخی شعر ملاحظہ ہو:
تاریخ وفات خواجہ حالیؔ ہستی حالیؔ سے حیف خالی "۱۳۳۳ھ" (علم تواریخ، ص ۸۳)

[۳] مقالہ "تاریخی مادے۔ صحت متن اور استنباط نتائج" مشمولہ ششماہی "نوائے ادب" بمبئی اپریل ۱۹۷۶ء ص ۵۶

[۴] خیابان تاریخ، ص ۶

یکسوئی اور فرصت کا عمل ہے۔ یہ عمل اصلاً کوہ کندن وکاہ بر آوردن کا مصداق ہے۔ مادہ بر آمد کرنے کے لئے تاریخ گو عام طور پر موقع و محل کی رعایت سے اولاً چند مناسب و موزوں الفاظ کا انتخاب کرتا اور عدد جوڑتا ہے اس کے بعد باقی ماندہ اعداد حاصل کرنے کے لئے لفظ یا فقرہ تلاش کرتا ہے جس سے مطلوبہ سنہ بر آمد ہو سکے۔ فرض کیجئے مادۂ تاریخ سے ۱۹۹۰ء پیدا کرنا ہے اور موقع ولادت فرزند کا ہے۔ اس کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے دو لفظ "فروغ احمد" کا انتخاب کریں جن کے اعداد کا میزان ۱۳۳۹ ہوتا ہے۔ اب ایسا لفظ ڈھونڈھنا ہے جو (۶۵۱) عدد کے مساوی ہو تاکہ (۱۳۳۹) اور (۶۵۱) کا میزان ۱۹۹۰ء ہو جائے ظاہر ہے کہ نام کی مناسبت سے ایسا لفظ "خان" ہے جس کی قیمت ۶۵۱ ہے۔ اس لئے نوزائیدہ بچہ کا تاریخی نام "فروغ احمد خاں" ہوگا جس سے سن ولادت ۱۹۹۰ء میلادی بر آمد ہو رہا ہے اور سنہ ہجری میں "اقتدار احمد خاں" (۱۴۱۰ھج) اگر چہ مادہ حاصل کرنے کے لئے اس طریقہ کار کی حیثیت قاعدہ کلیہ کی نہیں ہے کیونکہ بہت سے مادے الہامی نوعیت کے اور برجستہ ہوتے ہیں۔ تاہم یہ آسان ترکیب مادہ متخرج کرنے میں معاونت ضرور کرتی ہے۔[1]

تاریخ بر آمد کرتے وقت امور ذیل کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(۱) مادۂ تاریخ کا اظہار ہمیشہ حرف جر (Preposition) "فی" (میں) یا "عام" (سال) یا سنہ یعنی فلاں سال وغیرہ میں سے کسی ایک لفظ سے کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں مادہ جس سنہ رائجہ میں بھی حاصل ہوتا ہو اس کی طرف واضح الفاظ میں اشارہ کرنا بہتر ہے تاکہ مصرع یا فقرہ کے نیچے یا سامنے سنہ لکھا ہوا نہ ہو تب بھی قاری وہی سنہ بر آمد کر سکے۔ مثلاً حکیم سعادت علی خاں نائب ریاست رامپور (م۱۸۶۶ء) کی وفات کے قطعہ کا تاریخی شعر ہے۔

سن عیسوی میں ہے تاریخ فوت "سعادت علی خاں نے پائی وفات[2]" ۱۸۶۶ء

(۲) جہاں تک ممکن ہو مادہ ناقص الاعداد یا زائد الاعداد نہ ہو بلکہ سالم الاعداد ہونا چاہئے۔ مادۂ تاریخ جتنا صاف وسادہ، بر محل و برجستہ ہوگا اتنا ہی پر لطف اور بہتر ہوگا۔ بطور مثال: "عید

---

[1] ملاحظہ ہو: خیابان تاریخ، ص۵، ۲۳ تا ۲۴، معلم التاریخ از علی امجد حسین بدایونی ص۱۰۔ انیس سویں ی از شمیم امروہوی ص۹ نیز تغات ابجد شماری از ڈاکٹر سید احمد (کناڈا) ورق ۱۳ وغیرہ

[2] دیوان تواریخ از سید آل محمد بلگرامی، ص۳۱ مطبع نور الانوار، آرہ ۱۲۹۶ھ

قرباں بھی ہے قرباں شاہ پر" ۱۳۳۰ھ

(۳) الفاظ ذیل برائے قول آتے ہیں اس لئے انہیں عموماً مادہ کی ابتداء میں لانا چاہئے تاکہ یہ شامل مادہ نہ ہوں۔ بعض دفعہ یہ مادہ کے آخر میں بھی وارد ہوتے ہیں:

"ہست، است، باشد، گو، گفت، بشنو، کہہ، کہیے، ہاتف، ملہم، سروش، غیب، رضواں، ملک، فلک، عقل، دل خود وغیرہ۔ مثال کے طور پر:" کہہ" عبادت خانۂ عالی بنا ۱۲۹۷ھ "کہہ" شامل مادہ نہیں ہے۔

کاف بیانیہ (کہ) جب مادہ کے شروع میں آئے تو محسوب نہیں ہوگا مثلاً:

سروش غیب نے تاریخ کیا اچھی کہی محسن کہ "یاد مصطفیٰ سچا وسیلہ ہے شفاعت کا" ۱۳۰۶ھ۔

لیکن درمیان میں واقع ہو تو مادہ میں شامل ہوگا:" چھپا دیواں کہ تصویر معانی کا سراپا ہے" ۱۲۸۵ھ

(۴)" کل مغل پوں" (۱۱۷۹ھ) جیسی دل آزار، طنزیہ اور ہجویہ تاریخ سے احتراز کرنا چاہیے خواہ وہ ہجو ملیح ہو یا قبیح و صریح کم از کم اس کی آخر الذکر دو اقسام سے گریز تہذیب کا تقاضہ ہے۔ گرچہ شعرائے فارسی و اردو نے ہر دور میں اس قبیل کی تاریخیں کہی ہیں۔ مگر بعض شعرا کو اس کی پاداش میں سزا کا مرتکب بھی ہونا پڑا ہے۔

(۵) مادۂ تاریخ کو تہنیت و تعزیت کی تقریب سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ خلاف واقعہ اور مشتبہ مصرعہ سے پرہیز ضروری ہے مثلاً کسی کی وفات پر،، مٹی خراب" (۱۲۵۳ھ) کہنے کے بجائے "مات بخیر" (۱۲۵۳ھ) بھی کہا جا سکتا ہے۔

(۶) تاریخ بکھیڑے کی نہ ہو کیونکہ تکلیف اور صنائع کی پیچیدگی تاریخ کی برجستگی اور اس کا منشاء و مقصد ہی فوت کر دیتی ہے۔ دور کی کوڑی لانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی تاریخوں کے لئے ہم نے "پایان نامہ" کے باب دوم "اقسام اور صنائع" کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

(۷) تاریخ گوئی کا مقصد آسان طریقے سے مطلوبہ سال پیدا کرنا ہوتا ہے اس لئے ممکنہ حد تک تاریخ میں صنعت ریاضی کے چاروں بنیادی طریقوں جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم نیز فروعی طریقوں صنعت نادر اور طریقۂ توالی وغیرہ کے عمل کو برتنے سے بچا جائے تاکہ تاریخ گورکھ دھندا نہ بن جائے۔ صنعت ریاضی میں مادہ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا

ہے۔[1] لیکن تاریخ میں صنعت حسابیہ یا کسی دیگر صنعت کو بروئے کار لایا گیا ہے یا تعمیہ (تدخلہ و تخرجہ) کو ضرورتاً استعمال کیا گیا ہے تو اس کی جانب اشارہ کر دینا ضروری ہے مثلاً جلیل کے دیوان "تاج سخن" کی اشاعت پر نجم رامپوری کہتے ہیں:

'دیواں' کو لیکے 'ایک' یہ کہتا نکل گیا　　"دل کی جگہ بغل میں ہو دیواں جلیلؔ کا"

(۱۴۰۰-۷۲):۱۳۲۸ھ

(۸) کسی مادہ کے صرف حروف معجمہ یا مہملہ سے مطلوبہ سال بر آمد کرنا اگرچہ آسان ہوتا ہے مگر اس صورت میں بقیہ حروف منقوطہ یا غیر منقوطہ بیکار و معطل رہتے ہیں۔ مثلاً صنعت اعجام میں یہ مادہ ملاحظہ ہو:"کہ حروف معجمہ میں کہہ دو تاریخ کہ رضواں کو تمینہ ہو مبارک، ۱۴۱۲ھ لہٰذا مادہ کے تمام الفاظ (معجمہ و مہملہ) سے تاریخ مکمل کی جائے۔ لیکن ایک ہی مادہ تاریخ میں صنعت اعجام اور اہمال سے علیحدہ علیحدہ طور پر مطلوبہ سال نکالا جائے تو وہ مادہ تاریخ گوئی کے فن میں ایک اعلیٰ مثال ہوگا۔ بطور مثال درج ذیل تاریخ اس کا عمدہ نمونہ ہے:

منقوط میں ہجری ملے مصرع میں پائے عیسوی　　"لو مر گیا ہے آل احمد غمزدہ ہاشم علی

۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء

لیکن اس مادہ میں غیر منقوطہ حروف سے تاریخ بر آمد نہیں کی گئی۔ اگرچہ کوئی حرف معطل نہیں رہا۔ چنانچہ جویاؔ کی یہ تاریخ ملاحظہ ہو:

از حروف معجمہ و مہملہ تاریخ گفت　　"روضۂ فردوس ور شک صد جمال ہر ورق

(معجمہ و مہملہ سے ۱۲۸۳ھ)

یعنی مادہ کے حروف معجمہ "ض+ف+ش+ج+ق" کی قیمت ۱۲۸۳ ہوتی ہے جو مطلوبہ سنہ ہے۔ باقیماندہ حروف مہملہ سے بھی ۱۲۸۳ حاصل ہو رہا ہے۔

(۹) مادہ کے حروف کے میزان میں بعض دفعہ تاریخ گو سے سہو سرزد ہو جاتا ہے۔ اس لئے مادہ بر آمد کرنے کے بعد اس کے الفاظ کے تمام مکتوبی حروف کا بحساب ابجد (تاریخ گوئی کے ضوابط و قواعد کے تحت) از سر نو میزان کر لینا چاہئے۔ ایسی اغلاط

---

[1] ملاحظہ ہو دانش نامہ تحقیق باب دوم کے تحت صنعت ریاضی۔

[2] خیابان تاریخ (سرود غیبی) ص ۷۷۔

نہایت مشاق اور عبقری (Genius) تاریخ گویوں کے یہاں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً میر مہدی مجروح کہتے ہیں:

پئے سال تاریخ مجروح نے ۔۔۔ کہا "ہے یہی گلستان سخن"[1]

۱۳۱۶ھ (کذا ۱۳۱۱ھ)

یار تن پنڈوروی کہتے ہیں: "بن گیا ہے جلوۂ فردوس فردوس نظر"[2] ۱۹۶۳ء (کذا ۱۹۹۲ء)

(۱۰) مادہ کے الفاظ میں صحت املا کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ یعنی جس املا سے سنہ مطلوب حاصل کیا ہے وہی لکھا جائے۔ مثلاً بائے موحدہ (بمعنی ساتھ، سے) کو عام طور پر تین طرح لکھا جاتا ہے یعنی "ب، با اور بہ" اسی طرح نون نفی ن، نا نہ (ندیدہ، ناخواندہ) چونکہ مادۂ تاریخ میں ہر لفظ اپنے مخصوص املا کے ساتھ ایک خاص قیمت رکھتا ہے اور اس کی ظاہری ہیئت گوہر مقصود کی تلاش میں چراغ رہ کا کام دیتی ہے۔ اس لئے تاریخ گویا ناقل کے نوک خامہ کی ہلکی سی جنبش "ب" کو "با اور بہ" بنا سکتی ہے۔ جس سے مادہ لاحاصل اور اس کا وجود گمراہ کن ہو جاتا ہے مثال کے طور پر مومن کی وفات کا مادہ۔ "بشکست دست وبازو" (۱۲۶۸ھ) کئی تصنیفات میں۔ "بہ شکست دست وبازو" لکھا ہوا ملتا ہے۔[3] جس کے سبب ۱۲۷۳ خارج ہوتے ہیں۔ کاتب کا تصرف و تحریف اور کبھی مصحح کا اشہب قلم بھی کچھ کم کرشمہ نہیں دکھلاتا۔[4]

(۱۱) مکمل مصرعہ یا جملہ مادۂ تاریخ ہونا چاہئے مثلاً "پیدا ہوا ساعت میں قمر کی مہ آفاق" (۱۲۵۷ھ) فقرے یا مصرعے کے ایک جزو کو مادہ بنانا مناسب نہیں، جیسے رجب علی بیگ سرور

۱۔ مظہر معانی معروف بہ دیوان مجروح، ص ۲۴۰، سرفراز پریس، دہلی ۱۳۱۶ھ۔

۲۔ فن تاریخ گوئی از علامہ رتن پنڈوروی، ص ۹۲، جمال پریس دہلی ۱۹۸۴ء، نیز جلیل مانکپوری جیسے باکمال استاد کی یہ تاریخ بھی ملاحظہ ہو

جلیل اس جشن کی تاریخ کیا نایاب نکلی ہے ۔۔۔ "یہ آصفجاہ سابع تاجدار ہفت کشور ہو"

۱۹۱۶ء (کذا ۱۹۵۹ء) (جان سخن، ص ۲۳۹)

۳۔ دیکھیے تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری، ص ۳۰۹، ۱۹۸۶ء لکھنو، دیوان مومن مع شرح مرتبہ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، ص ۳۱ طبع پنجم، شانتی پریس الہ آباد، سنہ اشاعت درج نہیں، کلیات مومن صفحہ "ج" ناشر رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد ۱۹۷۱ء نیز "مومن خاں مومن۔ حیات اور شاعری" مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد، ص ۲۰۰ ناشر غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی دسمبر ۱۹۹۱ء

۴۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو مضمون "تاریخ قطعات اور تغیر املا کے نتائج" از عبدالرؤف خاں مشمولہ سہ ماہی نخلستان جے پور بابت جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء

کی تصنیف "فسانۂ عجائب" کا سال اختتام نوازش حسین خاں نوازش لکھنوی نے یہ لکھا ہے:

فلک ایں "گلستان بے خزاں داد" ۱۲۴۰ھ

یہاں یا تو پورا مصرع مادہ تاریخ ہونا چاہئے تھا یا محض "گلستانِ بے خزاں داد" کیونکہ مصرع اولیٰ:

"بجستم سال تاریخش نوازش"[1]

ہے یعنی قول شاعر ثانی مصرع میں "ملک ایں" نہ ہو کر پہلے مصرع میں موجود ہے۔

(۱۲) "زہے، خہے" جیسے کلمات تحسین و تعجب الفاظ آورد ہیں آمد نہیں۔ اس لئے مناسب مقام پر ہی انہیں استعمال کرنا چاہئے ورنہ نہیں۔ املا میں غلط العام کی پیروی کرنا چاہئے جیسے "طپش اور طپانچہ" کو تائے مثنات سے لکھنا صحیح ہے۔ مثلاً:

سال طبع اوسکا دل رنگین سے
کہا گلچیں نے 'زہے باغ و بہار'

۱۲۳۹ھ (باغ و بہار از میر امن دہلوی صفحہ آخریں مطبع مصطفائی لکھنو ۱۲۵۹ھ)

(۱۳) مصرع بہ لحاظ اوزان تمام عروضی قیود کا پابند رہے۔ نظم کو نثر پر ترجیح دی جائے۔ مادہ کو باقی عبارت یا اشعار سے وادین میں لکھ کر نمایاں اور ممتاز کر دیا جائے۔

(۱۴) حسابی مہارت بھی ضروری ہے۔ بلکہ عقد انامل (انگلیوں کے پوروں کی حرکات) کے ذریعہ شمار کرنے کی مشق اور مزاولت ہو تو بہتر ہے تاکہ ادھر مادہ مکمل ہو اور ادھر میزان کی تکمیل۔

(۱۵) جہاں تک ممکن ہو مادہ آیت پاک یا حدیث مبارکہ میں تلاش کیا جائے ورنہ ضرب المثل میں یا پھر کلمہ صفت و موصوف، مضاف و مضاف الیہ ورنہ یک لفظی حاصل کیا جائے یا شعر میں جو مطابق واقعہ اور مطلوبہ سنہ کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرتا ہو۔ الفاظ مہمل و بے معنی نہ ہوں اور نہ خلاف واقعہ۔[2]

---

[1] فسانۂ عجائب مرتبہ پروفیسر رشید حسن خاں ص ۳۴۴ ناشر انجمن ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۹۰ء

[2] مادہ کے سلسلہ میں نمبر ۱ تا ۱۵ کے لئے دیکھیے: خیابان تاریخ، ص:۸، ملہم تاریخ ص:۶، ۱۳، ۱۸، و ۲۱، افادۂ تاریخ ص:۱۰، بحر الفصاحت ص:۹۱۶، لوحۂ تاریخ ص:۴۵ و ۴۶، معلم التاریخ ص:۶۰۹ غرائب الجمل ص:۱۷۵ تا ۱۸۰، فن تاریخ گوئی از درد کاکوروی، گنجینۂ تاریخ از شفیق رضوی عماد پوری ص:۹، آزاد پریس ڈالی گنج لکھنو ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء فن تاریخ گوئی از رتن پنڈوروی ص:۱۷ تا ۱۸ نیز اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۸:۱۷۶ لاہور۔

QUDS DAY

Dr. S.Q. HUSSAIN

Introduction:

The Sacred land of Palestine, considered the land of Monotheistic Prophets, has been Inhabited Arabs for Centuries To The Tenets and Principles and Teachings and Traditions of Islam, Muslims Firmly Believe in These Prophets, Whose Names have been Repeatedly Mentioned in The Holy Book of Qur,an.

Baitul Muqaddas (Jerusalem)is One of The Ancient Cities of The World, Which is Under The illegitimate Usurpation of The Israeli Zionist Regime Since 1948 Outraging The Muslims allOver The World Because it is a Sacred Place and The First Qible of World Muslims and as Per The Quranic Statement This Was The Place from Where Prophet Muhammad (PBUH)Ascended to heaven in his "Meraj" The ruthless Killings of Jerusalem and other MuslimDominated Neighbouring Regions, Has Been a Cause of Concern For The Whole Human World Especially The Muslims, Who Have Since Been in Pain and Profound Sorrow.

Historical Background:

Throughout The Centuries The History of This Heavenly City intertwined With Bloody Conflicts and Conpuests by Many Powers Among Them Crusaders, Turks, Muslims, Persians and The British. In Brief, one of The greatest muslim commandrs nanoly Salahuddin Ayyubi Made Historic Victories Against Crusaders and Ultimately Liberated Jerusalem in 1192.

The Hstorical Documents Have Already Confirmed That Arabs Were The Main and Native Residebts of Palestine, Which Became a Part of Turkey,s Ottoman Empire in The16 Th Century. During World War I, as The Colonists Spread Their Supremnacy and influence in Islamic Trerritories, British Forces

Occupied Palestine Apparently Because Turkey Allied With Germany.

Following The British Occpation of Palestine, The British Foreign Secretary Arthur Balfour,Made The Proposal of Establishing a Jewish State in Palestine The Famous Balfour Declaration Was Confirmed By Governments at War With Turkey and Ultimately With The British Support, The State of Israel Before its Physical Existence Was First Established on The World Map in 1948 and Islamic land i.e.Palestine by driving the native residents mainly Muslims from their homeland though they were constiting 98% of the total population of palestine

History of Palestine at a glance:

1192 salahuddin Ayyubi liberated Palestine from the Crusaders. It remains as a Part of Ottoman Empire Till1916

1917 Britain Vows to Establish a Homeland For Jews in Palestine Under The Belfour Declaration.

1919 Palestine Conferene Started under The Patronage of The British High Commission.

1920 Jews Immigrants Started Coming in Palestine.

1923-28 A Relative lull Descended on Palestine.

1929 Al-Burap Revolution Erupted in Palestine.

1931 A Great Islamic Conference Was Held in Quds.

1935 The Revolution of Sheikh Izzuddin Al- Qassam Was Started With The Call of Jihad.

1935 60.000 Jews immigrated to Palestine With The Aim of an Organised Civil War.

1936 Another Revolution Was Started Following The Martyrdom of Al-Qassam on November 15,1935

1937 The Bill Committee Tables a Proposal of Setting an Arab State and a Jewish State in Palestine.

1939 Snother White Book Was issued Allowing The Arrival of 10,000 Jews immigrants in Palestine Per Annum for a Period of five Years.

1948 Britain Decides To Withdraw from Palestine With Effect From May 15, 1948

1948 Israel Came into Existence Contrary to The Wishes of The Palestinian People.

1948-63 A Number of Wars Took Place Between The Native Palestinians and The Jews immigrants. A Number of Top Ranking Religious Leadern Al-Banna Also Embraced Martydom During The Period.

1967 The Bloody War Took Place Between The Arabs and Israli Troops.

1969 The Al-Apsa Mospue Was Set Ablazed By The Zionists.

1970-73 Another War Took Place Between Arabs and The Israeli Troops.

1979 Camp David Accrd Was Signes Between Egypt and Israel.

1979 International Quds Day Was Declared by Imam Khomeini.

1981 King Fahd Made a Proposal of Compromise Known as Fahd Plan.

1982 Arab Summit Known as Fez Conferece Approved Fahd Plan.

1982 Israel launched an Attack on Lebanon.

1986 In View of The Massacres of Muslims in Sabra and Shatilla, The Islamic Republic of Iran Demanded The Expulsion of Israel From The World Organisations. But The Iranian Motion Was Defeated Besause of The Opposition ans Treacherous From The Voting.

11987 The People of Palestine Started Armed Islamic Jihad Against The Israeli Regime Which is Known as "Intifadah".

1994 A Zionist Armed Man Massacred a large Number of Muslims who Were Offering Namaz at Al-Khalil City.

Imam Khomeini and The Palestinian Problem:

Undoubtedly Late Imam Khomeini Was One Of Top Ranking Scholars of islam who allndful a remarkable portion of Their Thought, Writings ana Speeches To The Palestinan Cause. Over 25 Years and Exacrly Since Hes Appearance on The Social and Political Split Until Very Demise He Never Even For a Split Second, Pareted With The Palestininan Problem The shah, Relations With Zionists Was one of Three Major Questions Raised By Imam Khomeini in His Firat Political Uprising of 15 Th of Khordad (June,5,1963).

During His First Exile To Turkey in 1964, He Wrote "Isrel is a STate Of War With The Islamic Countries.. Now and Then I

Keep Warneng Against This Danger". While Reacting to The Stengthening of Irano-Zionist Relaions Imam Khomeini Wrote. I Declare To All The Islamic Countries To All Mucslims From The East to The West, That Muslim Shiites Are Enemies of Israel and Its Agents. They Condemn The Countries That Recognise Israel. in His Book of Fatwas Entitled "Tahrirul Wasilah, Which He Wrote During His Exile in Turkey, Imam Khomeini Makes it Obligatory on Islamic Countris to Sever the diplomatic and Commercial Relations With The islamic Countries Which Readh an Agreement Detrimental to the Interests of Islam and The Muslims. Not Only This But Also He Sends a letter To The Iranian Prime Minister at The Time Wherein He Refers Unepuivocally To The Zionist Entity in These Words "Never Make an Alliance With Israel, The Enemy of Islam and The Country That Made More Than One Million Muslims Homeless. Never Open The Muslim Markes To Israel and its Agents."

in His First Speech Afrer His Arrival in Najaf City of Iraq in 1965, Imam Khomeini Calls on Muslims To Unite and Pool Their Resources To Stand in The FAce of Zionism. He Admonishes Muslims Saying: "How is it Possible That a Handful of Jewish Highwaymen Could Turn More Than One Million Muslims Out of Palestine and Occupy it? Isn, t it Because of Our Deviation From The Right and They are Rallying Around Their Falsehood?"

During The Period of His Exile Imam Khomeini Paid Attention To all The Developments and Events Related to The Palestinan Problem in This Region. He Voiced His Views and made Calls to The Muslims, on Every Occasion Whether on The June 1967 War The Burning of Al-Apsa Mosque in 1969, The October War of 1973, The Camp David Accord of 1979 or Al-Sadat,s Visit To Quds in 1977. Contacts and Exchanged letters With The Palestinian leadership.He Supported The Armed Struggle of The Palestinan Commanders Morally, Politically and Financially to The Extent of Issuing a Fatwa Allowing The Spending Revenues From The Religious Taxes on The Palestinian Millitary Operations.

Declaration of International Quds Day:

Afrer The Grand Victory of The Ialamic Revolution and The

Establishment of The Islamic Republic of Iran in 1979, Imam Khomeini Ruptured Iran,s Relation With The Israeli Zionist Regime and Convertesd The Israeli Embassy in Tehran Into The Diplomatic Mission of The Palestinian People Struggling For The liberation of Their Homeland.

in August 1979, Imam Khomeini, The leader of The Revolution and The Founder of The Islamic Republic of Iran Declared The last Friday of The Blessed Month of Ramazan as "International Quds Day" in Order To Seek The Support of World Muslims To The legitimate Struggle of The Muslim People of Palestine By Organising Special Gatherings and Holding Demonstrations Exposing The Enemies of Islam and Their Ghastly Crimes. The Text of Imam Khomeini,s Message Reads as Under:

in The Name of God, Compassionate, The Merciful

For Years, I Heve Warned All Muslims Against The Menace Posed By Israeli Usurpers Who Have lately Intensifies Their Savage Raids on Our Palestinean Brothers and Sisters, Bent Upon The Destruction of Palestinian Freedom Their Homes and Shelters in Southern Lebanon.

I Call on The Muslims of Meslima Countries to Join Forces Against Israel and her Supporters in Order to Cut Off The Hands of The Aggressors and Usirpers on Palestine.

I invite all The Muslims Throughout The World, During These Fateful Period, Which Coild Also Become a Factor For Shaping The Future of The Palestinian People, to Declare The last Friday of The Holy Month of. Ramazan as The Day of Quds (Jerusalem). The Muslims Should actualise This day By Proclaiming International Support of The legitimate Rights of The Muslim Palestinian People.

I Pray to The Almighty Allah For The Victory of The Muslims Over The People of Kufr (Rejecters of Truth and Justice). Peace and Allah,s Blessings and Mercy on You.

-Ruhullah Musavi Khomeini

On The Eve of The First Internatonal Quds Day, Imam Khomeini Sent a Message Addressing The World Muslims on August 16, 1979 Wherein He Further Declared" The Day of

Quds is The Day of Islam. All Muslims Must Be Warned and Must Understand How Strong Their Spiritual and Economic Powers are. Muslims are one Billion People, Supported By God Islam and The Power of Faith. Why Should They Be Afraid?

Continiuing His Message, Imam Khomeini Made The Day of Palestine, But it is The Day of Islam."

in Brief, Imam Khomeini Used to address The World Muslims on The Occasion Of Quds Day. in Most of His Speeches and Interviews He Used To Draw The Attention of World Muslims Towards The Importance of Quds Day. This Practice Continued Till He Breathes his last in 1989.

After Imam Khomeini,s Death, leader of Islamic Revolution Ayatullah Syed Ali-e- Khamenei, in Pursuance of Imam Khoemini,s Viewpoints With Regard To All National and International Affairs, Made Every Possible Effort to Keep Alive The Day of Quds By Sending Messages To The World Muslims. in 1994, Ayatullah Khamenei in His Quds Day Message Referred To The Barbaric Crime of Killing The Innocent Palestinian Muslims By The Zionist Killers in The Occupied City of Al-Kbalil, While They Were Offering NamaZ at a Mospue and Made it Clear That The Peace Accords and Compromise Formulas are Nothing But a Scurse of Keeping The Attention of World Muslims Diverted From The Real Solution of The Problem of Palestine . Ayatullah Khamenen Said That The Palestinean People Can Get The Right of living a Peaceful life in Their Homes Only By Continuing Their Armed Struggle Against The Zionist Regime and By launching Attacks on The Strategic Army Hideouts and Intallations of The Usurper Israeli Government.

Sfruggling Against The Greatest Usupert of Muslim lands is as Important as any Wahib Mandatory Practices That our Religion Prescribes For us. The Prophe of Islam Said it 14 Centuries Ago: a Muslim Who Does Nothing Upon Hearing The Cries For Help of Other Muslims, Has no Right to Call Himself a Muslim.

☆☆

تبصرہ

نام کتاب : ملتِ اسلامیہ کی محسن شخصیات

نام مصنف: شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری صاحب دامت برکاتہم
خلیفۂ اجل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ

قیمت : مبلغ ساٹھ روپے (مجلد)

تبصرہ نگار : محمود سعید بلالی

ملنے کا پتہ : جامعہ عربیہ نور الاسلام، شاہ پیر گیٹ، میرٹھ (یوپی)

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری صاحب دامت برکاتہم کے فکر و نظر کی داد دینی ہوگی کہ انہوں نے کتاب کا موضوع بڑا ہی اہم، جامع اور ضروری چھانٹ کر خوب سلیقہ سے منتخب کیا ہے۔ یعنی "ملت اسلام کی محسن شخصیات" جسے دیکھنے اور پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف کے دل و دماغ میں دینِ اسلام کی سربلندی اور ملت اسلامیہ کی فلاح و بہتری کے لیے کس قدر درد و جذبہ موجود ہے جس سے یہ مترشح ہے کہ فاضل مصنف کی زندگی کا حاصل و مقصد اور خواہش ہی یہ ہے کہ جن مقدس و برگزیدہ دینی ہستیوں نے اپنی بے پناہ قابلیت و صلاحیت، حیثیت و استطاعت، علم و فکر، جان و مال وغیرہ سے میدانِ عمل میں ملتِ اسلامیہ کے لیے عظیم الشان کارنامہ انجام دیے ہیں انہیں کتابی صورت میں قلم بند کرکے ہمیشہ کے لیے تاریخ اسلام کا ایک جز بنا دیا جائے۔ تاکہ آنے والی اسلامی نسلوں کے لیے ان کی شاندار خدمات اور عظیم الشان کارنامے احسان و شکریہ کے ساتھ یادگار رہیں اور ملتِ اسلامیہ ان سے استفادہ بھی کرتی رہے۔ دوسرے ملت اسلامیہ میں ایسی ہستیاں ہمیشہ نمایاں ہوتی رہیں جن کا نصب العین دینِ اسلام کی سربلندی اور ملتِ اسلامیہ کی خدمت میں منہمک و مشغول و مستغرق رہنا ہی قرار پایا ہو۔

زیر مطالعہ کتاب میں ملت اسلام کی محسن شخصیات کی تعداد ۶۹ ہے اس سے یہ مطلب ہرگز اخذ نہ کیا جائے کہ ملت اسلام کے لئے شاندار خدمات ان ہی ۶۹ شخصیات نے انجام دی ہیں۔ بلکہ جانشین حکیم الاسلام خطیب العصر حضرت العلامہ مولانا محمد سالم صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کے ارشاد کے مطابق جو انہوں نے زیر تبصرہ کتاب میں بعنوان "مقدمتہ الکتاب" میں رقم فرمائے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں۔ "پیش نظر کتاب ملت اسلام کی محسن شخصیات میں مصنف کتاب حضرت العلام مولانا حکیم محمد اسلام صاحب دامت برکاتہم مہتمم مدرسہ نور الاسلام میرٹھ خلیفہ حجاز شیخ العرب والعجم عارف باللہ حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ العزیز سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے خدمت ملت کے مقام عظمت اور مجددیت کی دقیع وضاحت کے ساتھ لاتعداد محسنین ملت میں سے ان چند تاریخ ساز محسن شخصیات کو منتخب فرمایا ہے کہ جن سے برصغیر کے ملت اسلامیہ ذہنی وابستگی اور قلبی عقیدت مندی کے ساتھ زیادہ مانوس ہے اور حضرت مصنف نے زیادہ سے زیادہ عوامی افادہ کو پیش نظر رکھ کر ان کے ایمان افروز تذکروں کو سادہ و آسان اور انتہائی دلنشیں طرز تحریر میں یکجا فرمادیا ہے۔ جس کو دیکھ کر عرض کرنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ حضرت مصنف کی سلامتی فطرت اور اس تصنیف کے ذریعہ عامتہ المسلمین کی مربیانہ خدمات نے ان کو بھی اس زمرہ محسنین میں شامل فرمادیا ہے جن کے ذکر خیر کو کتابی صورت میں مرتب فرماکر حضرت موصوف نے یہ محفل علم وعرفان سجائی ہے۔

بارگاہ عالی اللہ رب العزت میں قبولیت کے یقین کے ساتھ اپنے یہ دعائیہ دوشعر حضرت مصنف مدظلہ کی نذر کرتا ہوں ۔

زندہ ہے اخلاص سے تیری صدائے حق شناس
اس پر کل شاہد بنیں گے، یہ زمین و یہ زمن
ہو رفیق زندگی، توفیق حق گوئی سدا
تجھ پر قرباں تاکہ ہوں دنیا کے تن من اور دھن

ہمارے خیال میں محترم حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری صاحب دامت برکاتہم نے مستقبل کے اہل قلم حضرات کے لئے اس اہم موضوع کی داغ بیل ڈالی ہے اور تبرک کے طور پر اپنے مبارک قلم سے ۶۹ ملت اسلام کی محسن شخصیات پر اظہار خیال فرمادیا ہے۔ مستقبل کے اہل قلم اس موضوع پر یقیناً حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحب انصاری کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لکھتے ہی رہیں گے اور ہاں! ملت اسلام کی محسن شخصیات کا تعلق برصغیر ہندوستان وپاکستان ہی کی حدود تک محدود نہ رہے بلکہ تمام عالم سے ملت اسلام کی محسن شخصیات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریخ کا جز بنایا جائے تاکہ درجہ بدرجہ حصوں میں ان کی دینی تعلیم وتربیت علمی وملی خدمات کا تذکرہ شائع ہوسکے۔

اس لئے زیر مطالعہ وزیر تبصرہ کتاب کو ہم حصہ اول کے بطور سمجھتے ہوئے توقع وخواہش رکھتے ہیں کہ اس کا حصہ دوم بھی حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری صاحب اپنے بابرکت قلم سے تصنیف

فرمادیں جس میں ہمیں ان کے رشحات قلم سے سیرت النبی کے مصنف اول علامہ شبلی نعمانی ؒ، رئیس الاحرار اور تحریک خلافت کے سپہ سالار و مولانا محمد علی جوہرؒ، شاعر مشرق علامہ محمد اقبال، نام نہاد مسلم حکمرانوں اور اشتراکیت کے خلاف علم جہاد بلند کرنے والے سید قطب شہید، رد قادیانیت کے مبلغ اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی، امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مجاہدانہ کردار ادا کرنے والے مجاہد ملت حضرت مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہارویؒ سحبان الہند مفسر قرآن مولانا احمد سعید دہلویؒ، مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمتہ اللہ علیہ، ڈاکٹر سید محمودؒ، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدیؒ اپنے دور الحاد سے واپسی و توبہ کے بعد انگریزی قرآن و تفسیر ماجدی کے مفسر اور مشہور اہل قلم وصاحب طرز ادیب و منصف حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، نیپال میں اسلامی درس و تدریس کی شمع روشن کرنے والے مولانا عبدالروف رحمانی جھنڈانگریؒ، مولانا حکیم محمد زماں حسینیؒ اور بیسویں صدی کی عظیم واہم اور سب سے بڑی برگزیدہ اسلامی شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمتہ اللہ برکاتہم کے علمی کارناموں اور ملت اسلامیہ کے لئے عظیم خدمات و قربانیوں کے احوال و کوائف دلچسپ پیرایہ میں پڑھنے کو نصیب ہو سکے۔ کیونکہ مولانا موصوف کے قلم میں بڑی جان اور بلا کی کشش ہے ان کی کتاب ایک بار کھول کر پڑھنے والا قاری اسے کتنا بھی چاہے ضروری کام کیوں نہ آن پڑ جائے کتاب پوری پڑھے بغیر چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

چنانچہ زیر تبصرہ کتاب ملت اسلام کی محسن شخصیات مصنفہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری صاحب دامت برکاتہم ملت اسلامیہ کے ہر پڑھے لکھے فرد کے لئے پڑھنے کے قابل کتاب ہے اسے تمام مدارس اسلامیہ کی لائبریریوں میں رکھا جائے اور اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اس لئے بھی ہونی چاہئے کہ اس موضوع پر یہ پہلی اہم کتاب ہے اس سے مستقبل کے اہل قلم کے لئے بھی ہمت افزائی کا راستہ کھلے گا۔ انشاء اللہ۔ داد و تحسین، شاباش و مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں مصنف کتاب حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری صاحب دامت برکاتہم کہ انہوں نے اپنی تمام تر قابلیت و صلاحیت کو ایسے عظیم و نیک کار خیر میں صرف کر کے اپنے اکیلے بل بوتے پر اتنے اہم موضوع پر کتاب تصنیف کر کے تمام ملت اسلامیہ کی طرف سے ایک قرض ادا کر دیا ہے اور مستقبل کے دینی و اسلامی اہل قلم حضرات کے لئے ایک اہم موضوع کی بنیاد رکھ دی ہے جس سے قیامت تک ملت اسلامیہ کی محسن شخصیات کے تذکروں کی اشاعت سے عالم اسلام کی صحیح معنوں میں رہنمائی ہوتی رہے۔

☆☆

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد ہفتم	۱۵۰	گلِ رعنا	۷۵
جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد ہشتم	۱۵۰	مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط	۷۵
جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات		مسلمانوں کا عروج و زوال	۱۲۵
جلد دوم حصہ اول	۷۵	مآثر و معارف	۱۵۰
جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو	۶۰	مسلمانوں کا نظمِ مملکت	۱۵۰
دیارِ پورب کے علم و علماء	۱۷۵	مسلمانوں کی بحری سرگرمیاں	۱۷۵
رہبرِ حج	۱۵	معارف الآثار	۱۰۰
رموزِ عشق	۱۲۵	مصباح اللغات	۲۵۵
رسائل عمر بن خطاب (عربی)	۱۷۵	مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانی نمبر	۳۰۰
زاد المعاد (سیرت خیر العباد) جلد اول	۲۵۰	مکارم اخلاق جلد اول	۱۵۰
زاد المعاد (سیرت خیر العباد) جلد دوم	۱۲۵	مکارم اخلاق جلد دوم	۱۵۰
زاد المعاد (سیرت خیر العباد) جلد سوم	۱۲۵	مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ	۵۰
زاد المعاد (سیرت خیر العباد) جلد چہارم	۱۲۵	عروج و زوال کا الٰہی نظام	۹۰
سدرۃ طوبیٰ	۵۰	نقشِ حکمت	۵۰
سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات	۲۰۰	وحدۃ الوجود	۲۵
سرمایہ	۵۰	ہفت تماشا (مرزا قتیل)	۹۰
سرکشی ضلع بجنور	۱۰۰	ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں	۱۵۰
فلسفہ کیا ہے	۵۰	ہندوستان میں مسلمانوں کا	
فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر	۱۵۰	نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول	۱۵۰
قرونِ اول کا ایک مدبر	۷۵	ہندوستان میں مسلمانوں کا	
قرآن اور تعمیرِ سیرت	۱۲۵	نظامِ تعلیم و تربیت جلد دوم	۱۲۵
قصص القرآن جلد اول	۲۵۰	آہنگ سرمدی (ترجمہ گیتائے منظوم)	۵۰
قصص القرآن جلد دوم	۲۰۰	حجلۂ گل	۵۰
قصص القرآن جلد سوم	۲۰۰	تاریخ علم فقہ	۵۰
قصص القرآن جلد چہارم	۲۰۰	تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی،	۵۰
قصص القرآن مکمل سیٹ	۸۵۰	تین تذکرے	۷۵
قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات	۵۰	صدیق اکبر	۲۵۰
کتابتِ حدیث	۰۰		

R.N.I.REGN. NO. 965/57 Price Single Copy :Rs.6/= Jan.-Feb.2000

BURHAN (Monthly)

Edited by : Amidur Rehman Usmani

4136, Urdu Bazar ,Jama Masjid Delhi-110006 Phone : 3262815

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

جلد: ۱۲۶
شمارہ: ۳، ۴
مارچ، اپریل ۲۰۰۰ء

برہان

اس شمارے میں

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
منیجر ماہنامہ برہان
4136-اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 فون نمبر: 3262815

زر تعاون
فی پرچہ: ۶ روپے
سالانہ: ۷۲ روپے
رحمٰن کمپوزرس دہلی
Ph.:6952082

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

بھارتیہ جنتا پارٹی نے عام پارلیمنٹری انتخاب کے وقت یہ اعلان کیا تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنا کوئی بھی ایجنڈا جو ہندوستانی عوام کے لیے نا قابل قبول ہے اسے چھوڑ دیا ہے اور اب وہ اپنی اتحادی پارٹیوں کے ساتھ افہام وتفہیم کے بعد جو بھی ایجنڈا بنے گا اسے ہی اپنی حکومت چلانے کے لیے استعمال کرے گی۔ چنانچہ انتخابات کے دوران میں اس کی حلیف پارٹیوں کے ساتھ ایک سمجھوتے کے تحت نیشنل ایجنڈا نام سے تشکیل دیا گیا اور اسی نیشنل ایجنڈے کے مطابق سرکار چلانے کے لیے ہندوستانی عوام سے وعدہ کیا گیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے اس وعدہ اور یقین دہانی کے پیش نظر ہندوستان کی بعض سیکولر جماعتوں نے اس کے ساتھ انتخابی مفاہمت کرلی۔ آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ شری چندرا بابو نائیڈو جو سیکولر خیالات کے ہیں اور جنہیں کانگریس کے سیکولرزم پر یقین نہیں ہے۔ انہوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے اس نیشنل ایجنڈہ پر یقین کیا۔ اسی طرح تامل ناڈو کے وزیر اعلیٰ مسٹر کرونا ندھی، اڑیسہ کے نوین پٹنائک اور مغربی بنگال کی ممتا بنرجی نے بھی بھارتیہ جنتا پارٹی کی فرقہ پرستی کو نظر انداز کر کے اس کے نیشنل ایجنڈے کو منظور کیا اور جنتا دل یونائیٹڈ کے شرد یادو، رام ولاس پاسوان، سمتا پارٹی کے جارج فرنانڈیز و نتیش کمار نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے نیشنل ایجنڈے کو دیکھ کر اسے فرقہ پرستی کے الزام سے بری کر دیا، اور پھر عوام الناس کے سامنے بھارتیہ جنتا پارٹی کی ہر طرح صفائی پیش کی۔ انتخاب میں بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی حلیف جماعتوں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور حکومت بن گئی۔ جناب اٹل بہاری نے وزیر اعظم اور ایل کے اڈوانی نے وزیر داخلہ اور شری

مرلی منوہر جوشی نے انسانی وسائل و تعلیمات کے وزیر کی حیثیت سے حلف لیا۔ حلیف پارٹیوں کو دوسرے ایسے محکمے دیئے گئے جن کا پالیسی سازی سے کم واسطہ تھا۔ کچھ عرصہ حکومت کے کام وکاج ٹھیک طرح سے چلتے رہے، لیکن اس کے بعد ابھی چھ مہینے ہی نہیں گذرے تھے کہ بھارتیہ جنتاپارٹی نے نیشنل ایجنڈے کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی نظریاتی پالیسی کے تحت کام کرنا شروع کر دیا۔ بھارتیہ جنتاپارٹی آر ایس ایس کے اثرات کے تحت ہی وجود میں آئی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس پر یقین کیا گیا کہ وہ سیکولر قدروں کی پاسداری کرے گی اور کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گی جس سے ہندوستان کی سیکولر قدروں کو نقصان پہونچے لیکن وہ اس بات پر زیادہ دیر جمی نہ رہ سکی۔ گجرات میں اس کی پارٹی کی حکومت ہے۔ اس نے وہیں سے سیکولر قدروں پر کلہاڑی چلانے کا کام شروع کیا۔ گجرات کی صوبائی سرکار نے اپنے یہاں سرکاری ملازمین کو آر ایس ایس میں شامل ہونے کی پابندی جو لگی ہوئی تھی اس کو اٹھاتے ہوئے اعلان کیا کہ اب کوئی بھی سرکاری ملازم آر ایس ایس میں شامل ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی اعتماد شکن بات تھی جسے بی جے پی کی حلیف جماعتوں کو اسے ٹوکنا چاہیے تھا، مگر وہ اس پر نہ صرف خاموش رہیں بلکہ کسی حد تک اس سے متفق بھی رہیں، جو ان کے سیکولر کردار کو مشکوک بناتا ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس نے (جس کا ایک عرصہ تک سیکولر کردار ٹھنڈے بستے میں پڑا ہوا تھا) بر وقت اس کے خلاف آواز اٹھا کر ہندوستانی عوام کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ کیونکہ آر ایس ایس کو غیر سیاسی تنظیم کہنے والے کیا اس امر سے بے خبر ہیں کہ آزادی کی تحریک کے قائد مہاتما گاندھی کا قتل آر ایس ایس ہی کے جوشیلے ورکر ناتھورام گوڈسے نے کیا تھا۔ ایک طرف تو بھارتیہ جنتاپارٹی گاندھی جی کا نام جپتی ہے اس وقت جب اسے ہندوستانی عوام سے ووٹ لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ اس تنظیم سے اپنے علی الاعلان وابستگی کو بھی دکھاتی ہے جس پر گاندھی جی کے قتل اور کئی فرقہ وارانہ فسادات میں ملوث ہونے کا

نظرات

بھارتیہ جنتاپارٹی نے عام پارلیمنٹری انتخاب کے وقت یہ اعلان کیا تھا کہ بھارتیہ جنتاپارٹی نے اپنا کوئی بھی ایجنڈا جو ہندوستانی عوام کے لیے ناقابل قبول ہے اسے چھوڑ دیا ہے اور اب وہ اپنی اتحادی پارٹیوں کے ساتھ افہام وتفہیم کے بعد جو بھی ایجنڈا بنے گا اسے ہی اپنی حکومت چلانے کے لیے استعمال کرے گی۔ چنانچہ انتخابات کے دوران میں اس کی حلیف پارٹیوں کے ساتھ ایک سمجھوتے کے تحت نیشنل ایجنڈا نام سے تشکیل دیا گیا اور اسی نیشنل ایجنڈے کے مطابق سرکار چلانے کے لیے ہندوستانی عوام سے وعدہ کیا گیا۔ بھارتیہ جنتاپارٹی کے اس وعدہ اور یقین دہانی کے پیش نظر ہندوستان کی بعض سیکولر جماعتوں نے اس کے ساتھ انتخابی مفاہمت کرلی۔ آندھراپردیش کے وزیراعلیٰ شری چندرابابو نائیڈو جو سیکولر خیالات کے ہیں اور جنہیں کانگریس کے سیکولرزم پر یقین نہیں ہے۔ انہوں نے بھارتیہ جنتاپارٹی کے اس نیشنل ایجنڈہ پر یقین کیا۔ اسی طرح تامل ناڈو کے وزیراعلیٰ مسٹر کرونا ندھی، اڑیسہ کے نوین پٹنائک اور مغربی بنگال کی ممتا بنرجی نے بھی بھارتیہ جنتاپارٹی کی فرقہ پرستی کو نظرانداز کر کے اس کے نیشنل ایجنڈے کو منظور کیا اور جنتادل یونائٹڈ کے شرد یادو، رام ولاس پاسوان، سمتاپارٹی کے جارج فرنانڈیز و نتیش کمار نے بھارتیہ جنتاپارٹی کے نیشنل ایجنڈے کو دیکھ کر اسے فرقہ پرستی کے الزام سے بری کر دیا، اور پھر عوام الناس کے سامنے بھارتیہ جنتاپارٹی کی ہر طرح صفائی پیش کی۔ انتخاب میں بھارتیہ جنتاپارٹی اور اس کی حلیف جماعتوں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور حکومت بن گئی۔ جناب اٹل بہاری نے وزیراعظم اور ایل کے اڈوانی نے وزیر داخلہ اور شری

مرلی منوہر جوشی نے انسانی وسائل و تعلیمات کے وزیر کی حیثیت سے حلف لیا۔ حلیف پارٹیوں کے دوسرے ایسے محکمے دیئے گئے جن کا پالیسی سازی سے کم واسطہ تھا۔ کچھ عرصہ حکومت کے کام وکاج ٹھیک طرح سے چلتے رہے، لیکن اس کے بعد ابھی چھ مہینے ہی نہیں گذرے تھے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے نیشنل ایجنڈے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی نظریاتی پالیسی کے تحت کام کرنا شروع کر دیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی آر ایس ایس کے اثرات کے تحت ہی وجود میں آئی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس پر یقین کیا گیا کہ وہ سیکولر قدروں کی پاسداری کرے گی اور کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گی جس سے ہندوستان کی سیکولر قدروں کو نقصان پہونچے لیکن وہ اس بات پر زیادہ دیر جمی نہ رہ سکی۔ گجرات میں اس کی پارٹی کی حکومت ہے۔ اس نے وہیں سے سیکولر قدروں پر کلہاڑی چلانے کا کام شروع کیا۔ گجرات کی صوبائی سرکار نے اپنے یہاں سرکاری ملازمین کو آر ایس ایس میں شامل ہونے کی پابندی جو لگی ہوئی تھی اس کو اٹھاتے ہوئے اعلان کیا کہ اب کوئی بھی سرکاری ملازم آر ایس ایس میں شامل ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی اعتماد شکن بات تھی جسے بی جے پی کی حلیف جماعتوں کو اسے ٹوکنا چاہیے تھا، مگر وہ اس پر نہ صرف خاموش رہیں بلکہ کسی حد تک اس سے متفق بھی رہیں، جو ان کے سیکولر کردار کو مشکوک بناتا ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس نے (جس کا ایک عرصہ تک سیکولر کردار ٹھنڈے بستے میں پڑا ہوا تھا) بر وقت اس کے خلاف آواز اٹھا کر ہندوستانی عوام کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ کیونکہ آر ایس ایس کو غیر سیاسی تنظیم کہنے والے کیا اس امر سے بے خبر ہیں کہ آزادی کی تحریک کے قائد مہاتما گاندھی کا قتل آر ایس ایس ہی کے جوشیلے ورکر ناتھورام گوڈسے نے کیا تھا۔ ایک طرف تو بھارتیہ جنتا پارٹی گاندھی جی کا نام جپتی ہے اس وقت جب اسے ہندوستانی عوام سے ووٹ لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ اس تنظیم سے اپنے علی الاعلان وابستگی کو بھی دکھاتی ہے جس پر گاندھی جی کے قتل اور کئی فرقہ وارانہ فسادات میں ملوث ہونے کا

الزام لگ چکا ہے۔ سرکاری ملازمین کو اگر ایسی فرقہ پرست تنظیم میں شمولیت کی اجازت دی گئی تو پھر دوسری اور تنظیمیں بھی سرکاری ملازمین میں گھس پیٹھ کریں گی جسے روک پانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بات بہت ہی اچھی ہوئی کہ کانگریس نے اس کے خلاف ایسی زوردار طریقہ سے آواز بلند کی کہ بھارتیہ جنتاپارٹی کی حلیف جماعتوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے بھی سرکاری ملازمین کے لیے آر ایس ایس کی چھوٹ کی مخالفت کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی کانگریس کے زوردار احتجاج کی بدولت آخر کار بھارتیہ جنتاپارٹی کی گجرات کی صوبائی سرکار آر ایس ایس سے متعلق اپنے فیصلہ کو واپس لینے پر مجبور ہوگئی۔ اس سلسلے میں بھارتیہ جنتاپارٹی اپنے سیکولر مغائر خفیہ نظریات ملک پر تھوپنے کے لیے کس طرح کام کر رہی ہے یا کرے گی، اس بابت بڑے ہی صاف طریقے سے معقول انداز میں سابق وزیر اعظم جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے اظہار خیال کیا ہے، ملاحظہ کریں۔

”قومی جمہوری محاذ میں جس طرح سے اندرخانے مخالفت ابھرنے لگی ہے اس سے واجپئی سرکار کے پورے پانچ سال چلنے کی امید کم ہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ چھ مہینے میں ہی راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ جیسے سوال اس سرکار کو پریشان کرنے لگے ہیں۔ آنے والے وقت میں ان پریشانیوں کے بڑھنے ہی کے آثار ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت اپنی اتحادی جماعتوں کے عوامی اثرات پر قابض ہونا چاہتی ہے ایسے اگر حلیف چوکنے رہیں تو دونوں میں ٹکراؤ ہوگا اور ہوشیار نہ رہیں تو اپنا وجود ہی کھو دیں گے ... بھارتیہ جنتاپارٹی بڑی گہری پالیسی کے تحت اپنے اتحادیوں کی نظریاتی مخالفت کو ختم کرنا چاہتی ہے اس کے بعد اس کی اسکیم سیٹوں کے تال میل کے ذریعہ ان کے عوامی اثرات تک بالکل ختم کرنے کی ہے۔ آئین پر نظر ثانی کمیشن کے مسئلے پر بھارتیہ جنتاپارٹی اپنے اتحادیوں کو مغالطہ دے کر ان کی نظریاتی تنقید ختم کرانے میں بھی کامیاب ہوگئی ہے... گجرات سرکار کے ذریعہ اپنے

ملازمین کو راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کی شاکھاؤں میں جانے کی چھوٹ کے سوال پر مخالف جماعتوں کے دباؤ سے بھاجپا کو جھکنا پڑا، لیکن وہ ایسی کوشش پھر کر سکتی ہے۔اس کے اتحادی جاگتے رہے تو ٹھیک ہے ورنہ تواس کے پاس بھاجپا کی گود میں جانے کے سوائے کوئی دوسرا راستہ نہیں بچے گا۔"

گجرات میں کانگریس کی زوردار مخالفت کے بعد بھاجپا کو آر ایس ایس کے مسئلے پر جھکنا پڑا لیکن یوپی میں مدرسوں ومسجدوں کی تعمیر پر جس طرح یوپی سرکار نے جو حکم صادر فرمایا ہے اس سے ہندوستان کی اقلیت میں زبردست بے چینی اور مایوسی پائی جاتی ہے۔ سرکاری اسکولوں میں آر ایس ایس کے نظریات کو تھوپنے کے لیے اندرون خانہ بڑی تیزی سے کام ہو رہا ہے جس سے عوامی طبقہ میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع ہو چکی ہیں، تاریخ میں پھیر بدل کی کوششیں بھی جاری ہیں اور آئین کو بھی نظر ثانی کی آڑ میں بدل ڈالنے کی چالیں چلی جارہی ہیں۔ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب وتمدن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔کیا یہ باتیں ملک وقوم کے مفاد میں کسی بھی طرح گردانی جاسکتی ہیں ویسے ہی ہندوستانی عوام مہنگائی کی مار سے بے حال ہیں۔بجٹ ۲۰۰۱ء ر ۲۰۰۰ء میں غریب عوام کو مہنگائی کی مار سے بچانے کی کوئی ٹھوس تدابیر نہیں اختیار کی گئی ہیں۔عوام کے بیشتر حلقوں میں بجٹ کو غریب عوام کی امیدوں کے برخلاف بتایا گیا ہے۔غیر ملکی کمپنیوں کے ہندوستان میں داخلے کے دروازے فراخدلی کے ساتھ کھولے جارہے ہیں لیکن اکثر ہندوستانیوں کے حالات سدھارنے کے لیے سنجیدگی کے ساتھ کوئی اقدام نہیں کیا جارہا ہے۔بھارتیہ جنتا پارٹی کو ایمانداری کے ساتھ عوام کی تکالیف کو دور کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے نہ کہ جذباتی مسائل کو ابھار کر عوام کو ان کے بنیادی مسائل سے غافل کرنے سے اس کا قطعاً بھلا نہیں ہوگا،ہندوستان کا ضمیر سیکولر قدروں سے بنا ہے اور بنا رہے گا جس نے بھی ان سیکولر قدروں سے کھلواڑ کرنے کی کوشش کی تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ایسا ہمارا یقین ہے۔ ☆☆☆

الزام لگ چکا ہے۔ سرکاری ملازمین کو اگر ایسی فرقہ پرست تنظیم میں شمولیت کی اجازت دی گئی تو پھر دوسری اور تنظیمیں بھی سرکاری ملازمین میں گھس پیٹھ کریں گی جسے روک پانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بات بہت ہی اچھی ہوئی کہ کانگریس نے اس کے خلاف ایسی زور دار طریقہ سے آواز بلند کی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی حلیف جماعتوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے بھی سرکاری ملازمین کے لیے آر ایس ایس کی چھوٹ کی مخالفت کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی کانگریس کے زوردار احتجاج کی بدولت آخرکار بھارتیہ جنتا پارٹی کی گجرات کی صوبائی سرکار آر ایس ایس سے متعلق اپنے فیصلہ کو واپس لینے پر مجبور ہو گئی۔ اس سلسلے میں بھارتیہ جنتا پارٹی اپنے سیکولر مخائر خفیہ نظریات ملک پر تھوپنے کے لیے کس طرح کام کر رہی ہے یا کرے گی، اس بابت بڑے ہی صاف طریقے سے معقول انداز میں سابق وزیراعظم جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے اظہار خیال کیا ہے، ملاحظہ کریں۔

"قومی جمہوری محاذ میں جس طرح سے اندر خانے مخالفت ابھرنے لگی ہے اس سے واجپئی سرکار کے پورے پانچ سال چلنے کی امید کم ہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ چھ مہینے میں ہی راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ جیسے سوال اس سرکار کو پریشان کرنے لگے ہیں۔ آنے والے وقت میں ان پریشانیوں کے بڑھنے ہی کے آثار ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت اپنی اتحادی جماعتوں کے عوامی اثرات پر قابض ہونا چاہتی ہے ایسے اگر حلیف چوکنے رہیں تو دونوں میں ٹکراؤ ہوگا اور ہوشیار نہ رہیں تو اپنا وجود ہی کھو دیں گے... بھارتیہ جنتا پارٹی بڑی گہری پالیسی کے تحت اپنے اتحادیوں کی نظریاتی مخالفت کو ختم کرنا چاہتی ہے اس کے بعد اس کی اسکیم سیٹوں کے تال میل کے ذریعہ ان کے عوامی اثرات تک بالکل ختم کرنے کی ہے۔ آئین پر نظر ثانی کمیشن کے مسئلے پر بھارتیہ جنتا پارٹی اپنے اتحادیوں کو مغالطہ دے کر ان کی نظریاتی تنقید ختم کرانے میں بھی کامیاب ہو گئی ہے... گجرات سرکار کے ذریعہ اپنے

ملازمین کو راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کی شاکھاؤں میں جانے کی چھوٹ کے سوال پر مخالف جماعتوں کے دباؤ سے بھاجپا کو جھکنا پڑا، لیکن وہ ایسی کوشش پھر کر سکتی ہے۔ اس کے اتحادی جاگتے رہے تو ٹھیک ہے ورنہ تو اس کے پاس بھاجپا کی گود میں جانے کے سوائے کوئی دوسرا راستہ نہیں بچے گا۔"

گجرات میں کانگریس کی زوردار مخالفت کے بعد بھاجپا کو آر ایس ایس کے مسئلے پر جھکنا پڑا لیکن یوپی میں مدرسوں و مسجدوں کی تعمیر پر جس طرح یوپی سرکار نے جو حکم صادر فرمایا ہے اس سے ہندوستان کی اقلیت میں زبردست بے چینی اور مایوسی پائی جاتی ہے۔ سرکاری اسکولوں میں آر ایس ایس کے نظریات کو تھوپنے کے لیے اندرون خانہ بڑی تیزی سے کام ہو رہا ہے جس سے عوامی طبقہ میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع ہو چکی ہیں، تاریخ میں پھیر بدل کی کوششیں بھی جاری ہیں اور آئین کو بھی نظر ثانی کی آڑ میں بدل ڈالنے کی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب و تمدن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ کیا یہ باتیں ملک و قوم کے مفاد میں کسی بھی طرح گردانی جا سکتی ہیں ویسے ہی ہندوستانی عوام مہنگائی کی مار سے بے حال ہیں۔ بجٹ ۲۰۰۱ء / ۲۰۰۰ء میں غریب عوام کو مہنگائی کی مار سے بچانے کی کوئی ٹھوس تدابیر نہیں اختیار کی گئی ہیں۔ عوام کے بیشتر حلقوں میں بجٹ کو غریب عوام کی امیدوں کے برخلاف بتایا گیا ہے۔ غیر ملکی کمپنیوں کے ہندوستان میں داخلے کے دروازے فراخدلی کے ساتھ کھولے جا رہے ہیں لیکن اکثر ہندوستانیوں کے حالات سدھارنے کے لیے سنجیدگی کے ساتھ کوئی اقدام نہیں کیا جا رہا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ایمانداری کے ساتھ عوام کی تکالیف کو دور کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے نہ کہ جذباتی مسائل کو ابھار کر عوام کو ان کے بنیادی مسائل سے غافل کرنے سے اس کا قطعاً بھلا نہیں ہوگا، ہندوستان کا ضمیر سیکولر قدروں سے بنا ہے اور بنا رہے گا جس نے بھی ان سیکولر قدروں سے کھلواڑ کرنے کی کوشش کی تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ ایسا ہمارا یقین ہے۔　　☆☆☆

(پانچویں قسط)

فن
تاریخ گوئی کی ابتداء

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں ڈبل ایم، اے. پی، ایچ، ڈی (لیکچرر)
انٹر کالج اٹاوہ ضلع کوٹہ (راجستھان)

علم التاریخ اور تاریخ گوئی میں فرق: تاریخ (History) اور تاریخ گوئی میں یہ بنیادی فرق ہے کہ تاریخ صرف شہنشاہوں کے حالات و واقعات کی کھتونی ہے جس میں معاصر مورخ یا وقائع نگار عمر کا ایک قابل لحاظ حصہ صرف کر کے اور بہت سے مفادات و مصلحتوں کو حق و صداقت کی قربان گاہ پر چڑھا دینے کے بعد اعتبار و استناد حاصل کرتا ہے۔ جبکہ تاریخ گوئی کی ہمہ گیری و آفاقیت کا عالم یہ ہے کہ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے ہر چھوٹے بڑے اور اہم و غیر اہم واقعہ کے لئے اس کے دامن میں گنجائش موجود ہے۔ یہ فن معمولی واقعہ کو بھی تاریخی حیثیت عطا کر دیتا ہے ایک تاریخ گو بہت قلیل وقت میں تھوڑی سی کاوش فکر کے بعد ہر قسم کی جنبہ داری، تعصب، مصلحت کوشی اور اس قسم کے تمام شبہات سے بالاتر رہ کر مورخ کا شریک اور سہیم بن جاتا ہے۔

حساب العقد: فن تاریخ گوئی بڑی حد تک دانستہ اور شعوری عمل ہے جس میں متبادل الفاظ اور متبادل طریق اظہار پر اعداد کی قید کے ساتھ غور و خوض کرتے ہوئے الفاظ و اعداد کا ایک خوبصورت پیکر تراشنا پڑتا ہے۔ اس لئے ایک تاریخ گو کو حساب العقد پر بھی دسترس حاصل کرنا ضروری ہے۔ تاریخ گوئی اور حساب العقد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فی البدیہہ و برجستہ کہے گئے مصرع مادہ کے حروف کا میزان فوری طور پر اسی طریق حساب کے ذریعہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اصلاً انگلیوں کے پوروں پر اعداد شمار کرنے کے طریقہ کو حساب العقد، حساب

العقد، حساب العقود، حساب القبضہ بالید، حساب الید اور عقد انامل کہتے ہیں۔ عُقد یا عَقد بمعنی جوڑ یا انگلیوں کے بنان (پورے) اور انامل (انملہ کی جمع) کے معنی انگلیاں ہیں۔ انگلیوں کے جوڑوں اور پوروں سے حساب کرنے اور انگلیوں کو ایک مخصوص طریقہ سے کھولنے اور باندھنے سے اعداد کے شمار کا یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں کاغذ پنسل وغیرہ کی ضرورت پیش نہیں آتی اور کسی آلہ کے بجائے محض ہاتھ کی انگلیوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ عربوں میں حساب کا یہ طریقہ بہت پرانے زمانے سے رائج تھا۔ بعض اشاروں سے پتا چلتا ہے کہ اہل عرب ضرورت کے وقت ہاتھ پھیلا کر ایک یا دو انگلیوں کو موڑ کر نہ صرف چھوٹے اعداد کا ہی اظہار کرتے تھے بلکہ وہ اپنی انگلیوں کو مخصوص شکل میں جوڑ کر بڑے اعداد کو بھی ظاہر کر سکتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی انگلیوں کی جو بعض حرکات استعمال فرمائی تھیں وہ کتب احادیث شریفہ میں موجود ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کی انگلیوں کی حرکات ایسے اعداد کو ظاہر کرتی تھیں جو ایک خاص نظام (نظام العقد) سے مطابقت رکھتی تھیں۔[1]

کہا جاتا ہے کہ عقد انامل کے طریقے سے شمار کرنے کی ایجاد کا سہرا حکیم بو علی سینا[2] (م ۴۲۸ھ / ۱۰۳۷ء) کے سر ہے جنہوں نے ۴۲۰ھ مطابق ۱۰۲۹ء میں یہ نظام دریافت کر کے حساب کنندگان (محاسب) کو قلم، کاغذ اور تختیوں (شمار ندوں) کے استعمال کی زحمت سے نجات دلائی۔[3] بہر حال اس طریق شمار میں سہولت یہ ہے کہ اس میں نہ تو سہو و نسیان ہی کا امکان رہتا ہے اور نہ لوازمات تحریر ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ماہر تاریخ گو جو حساب العقد کے اس طریقہ سے پوری طرح واقف ہوگا وہ فی البدیہہ مادہ کہہ کر فوراً ہی اس کے اعداد

---

[1] ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد ۴: ۵۳-۷۵۲ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۱۹۷۷ء بار دوم، اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۸: ۱۸ عقد انامل سے متعلق تفصیلی طریق کار کے لئے دیکھئے غیاث اللغات ص ۳۰۰ تا ۳۰۱ تطویل کے سبب ہم نے غیاث کی مطلوبہ فارسی عبارت کے ترجمہ سے گریز کیا ہے۔

[2] پورا نام ابو علی الحسین بن عبداللہ بن سینا تھا۔ ابن سینا اس کی کنیت تھی۔ اسی کنیت سے وہ زیادہ مشہور ہے۔ اپنی عظمت کی بنا پر شیخ الرئیس، معلم ثانی اور استاذ الاساتذہ کہلاتا ہے۔ بخارا کے قریب ایک قریہ میں ۳۷۰ھ / ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اور ۵۸ سال کی عمر میں ۴۲۸ھ / ۱۰۳۷ء میں یہ آفتاب علم و فضل ہمدان میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ موصوف کی تصانیف نے پورے یورپ پر حکمرانی کی (تاریخ طب و اطباء قدیم از پروفیسر سید علی حیدر صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۱ اصبا پبلشرز علی گڑھ ۱۹۹۴ء بار سوم)۔

[3] اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۸: ۱۷۶۔

بھی شمار کرلے گا۔ لیکن آج کل مادۂ تاریخ کے اعداد کا میزان قلم اور کاغذ سے لگایا جاتا ہے اور اب تو کمپیوٹر عام ہوگیا ہے۔

مختلف سنین: تاریخ گوئی کے تعلق سے دنیا میں رائج بعض سنین کا اختصار اً ذکر کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ تاریخ کسی نہ کسی سنہ میں ہی برآمد کی جاتی ہے۔ عربی زبان میں سنہ بمعنی سال ہے جس کی جمع سُنون، سِنون، سنوات اور سنہات آتی ہے[1] لیکن فارسی میں اس کی جمع سنین ہے اور یہی اردو میں بھی رائج ہے۔ سال یا تو شمسی ہوتا ہے یا قمری۔

سال شمسی: اہل ہیئت نے آفتاب کے اپنے برج میں حرکت کرنے پر سال کی بنیاد رکھی ہے۔ یعنی آفتاب کا اپنے مفروضہ منطقت البرج[2] (لگن منڈل یا راشی چکر Zodiac) سے جدا ہوکر اپنی ذاتی حرکت سے پھر اسی نقطہ پر پلٹ آنے کو سال کہتے ہیں۔ یہ مدت ایک سال پر محیط ہوتی ہے کیونکہ آفتاب ایک برج کو ایک ماہ میں طے کرتا ہے اس لئے سال میں بارہ مہینے ہوتے ہیں۔ شمسی سال ۳۶۵ دن اور ۶ گھنٹے کا ہوتا ہے اور چوتھے سال ۳۶۶ دن کا واضح ہو کہ یہ سال وضعی وغیر حقیقی ہوتا ہے۔

سال قمری: جس طرح آفتاب اپنے ائرے (مدار)[3] میں گردش کرتا ہے اسی طرح قمر بھی دورہ کرتا ہے لیکن چاند کے بارہ دورے سورج کے ایک دورہ کے برابر ہوتے ہیں اور اس کے ہر دورے کی مدت کا نام ماہ اور بارہ دوروں کی مدت کا نام سال قرار دیا گیا ہے۔ اس کو قمری حقیقی سال کہتے ہیں لیکن جس مدت کو ماہ و سال کہتے ہیں وہ اصطلاحی ہے قمری سال ۳۵۴ دن ۸ گھنٹے اور ۴۵ منٹ کا ہوتا ہے۔

دنیا کی تمام قدیم اقوام میں ماہ و سال کا انحصار چاند کی رویت پر تھا یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں مہینے کے لئے جو الفاظ ملتے ہیں ان سب کا تعلق چاند سے ہے۔ مثلاً فارسی میں

---

[1] مصباح اللغات صفحہ ۴۰۲

[2] آسمان پر ایک نہایت وسیع دائرہ جس پر بارہ آسمانی برج واقع ہیں۔ ان بروج کے نام یہ ہیں: حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔

[3] ماہرین فلکیات جانتے ہیں کہ ستارے اپنے اپنے مدار پر گردش کرتے ہیں۔ "مدار" دائرے اور حلقہ کو کہتے ہیں، جس کی شکل بیضوی ہوتی ہے۔ دیکھئے ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۹۵ء صفحہ ۵۱

ماہ اور ہندی ماس[1] (چاند، قمر، ماہ، چندر) بھی چاند کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح انگریزی لفظ Month لاطینی (رومی) Mensis (Latin، جرمن Manod قدیم نارو تھین Monuther گاتھ (Goth) Manuths کا تعلق چاند ہی سے ہے۔ آریائی زبانوں (فارسی اور سنسکرت) کے علاوہ سامی زبانیں بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ عربی لفظ سنہ، غالباً "سِن (سین) دیوتا کی یاد دلاتا ہے جو تمام سامی اقوام میں چاند کا دیوتا شمار ہوتا تھا عربی زبان میں سال کے لئے دوسرا لفظ "عام" ہے جس کا تعلق بھی چاند سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ قدیم عرب چاند دیوتا کو "عم" بھی کہتے تھے۔[2]

دنیا کی قوموں نے اپنے سنین کا آغاز عموماً اپنی مرکزی شخصیت کے یوم پیدائش یا اپنے دور عروج کے کسی واقعہ سے کیا ہے۔ مثلاً عیسوی سنہ یا بکری اور شاکا سمبت وغیرہ۔ لیکن جب سے انسانی ذہن نے وقت کے حساب رکھنے کا التزام کیا ہے اس وقت سے اب تک نہ جانے کتنے سنین صفحۂ ہستی پر رائج ہوئے اور فنا ہوگئے[3] مگر فی زمانتا ہجری، عیسوی، بکرمی، شک اور فصلی سنین ہی زیادہ رائج ہیں جن میں عام طور پر تاریخیں برآمد کی جاتی ہیں۔ لیکن ایک تاریخ گو آزاد ہے کہ وہ اپنی سہولت یا مشاقی کا مظاہرہ کرنے کے لئے دوسرے سنین میں بھی تاریخیں برآمد کر سکتا ہے۔ ذیل میں ایسے ہی چند سنین کا تعارف اجمال طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ہجری سنہ: تاریخ گوئی کا سہرا عربی رسم خط والی زبانوں خصوصاً فارسی اور اردو کے سر ہے۔ اس لئے ایک عرصہ تک بیشتر تاریخیں ہجری سنہ میں ہی نکالی جاتی رہی ہیں۔ تقویم[4] عموماً مہذب اور متمدن قوموں کی اجتماعی زندگی کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت ہے لیکن ظہور

---

[1] سنسکرت ہندی کوش از وامن شورام آپٹے صفحہ ۷۹۹

[2] برائے تفصیلات دیکھئے: فن تحریر کی تاریخ ۱۶۹، میزان التواریخ صفحہ ۳۸ مؤلفہ مولوی محمد عبید اللہ بصیر ٹونکی، نایاب برقی پریس دہلی ۱۳۵۶ھ، مقالہ "واقعات سیرت نبوی میں توقیتی تضاد اور اس کا حل" مشمولہ ماہنامہ برہان دہلی بابت جون ۱۹۶۴ء صفحہ ۳۳۰ نیز مقالہ "اسلامی شمسی قمری سال" از مولانا ابوالجلال ندوی، مشمولہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۲۷ء صفحہ ۳۶۷۔

[3] کل راگ کسی کا گاتی تھی، کل راگ کسی کا گائیگی تاریخ بدلتی آئی ہے، تاریخ بدلتی جائے گی

[4] معاشرتی و عائلی ضرورتوں اور مذہبی رسوم کو مد نظر رکھ کر دنوں کو زمانوں میں متحد کرنے یا سائنسی احتیاجوں میں ہفتوں، مہینوں اور برسوں کو مجتمع کرنے کے طریقے کو تقویم کہتے ہیں۔ رک "مفتاح التقویم" از حبیب الرحمن خاں صابری صفحہ ۲۱ فقرہ ۲ نیز صفحہ ۳۸ فقرہ ۵۹ غیاث اللغات صفحہ ۱۰۴۔

اسلام سے قبل اہل عرب اتنے متمدن نہ تھے کہ وہ کسی مستقل تقویم کو اپنے معاشرے میں رائج کرتے یہی وجہ تھی کہ وہ ایام جاہلیت میں اپنی سہولت کے پیش نظر اپنی قومی تاریخ کے کسی اہم واقعہ سے وقت کا حساب لگا لیتے تھے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت (۱۳ھ ۶۳۴ء تا ۲۳ھ ۶۴۴ء) میں جب مملکت اسلامی کے حساب کتاب زیادہ وسیع ہوئے اور گورنروں کو آئے دن احکامات بھیجنے پڑے تو ضرورت ہوئی کہ کسی ایک واقعہ کو نقطہ آغاز قرار دے کر سرکاری سنہ رائج کیا جائے چنانچہ حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ میں مجلس مشاورت طلب کی جس میں حضرت علیؓ کی اس رائے کو ترجیح دی گئی کہ اسلامی تقویم کا آغاز نبی اکرم ﷺ کی ہجرت کے سال سے کیا جائے ہجرت کا واقعہ حالانکہ ماہ صفر کے عشرہ آخر میں پیش آیا تھا۔ مگر چونکہ عرب میں سال ماہ محرم سے شروع ہوتا ہے اس لئے تقریباً ایک ماہ ستائیس دن کے تفاوت کو نظر انداز کرتے ہوئے سنہ ہجری کا آغاز یکم محرم روز پنج شنبہ (جمعرات) سے کیا گیا جو ۱۵ار جولائی ۶۲۲ء کے مطابق ہے[1] دیگر سنین عالم کے برخلاف ہجری سنہ شمسی نہ ہو کر قمری ہے۔ اس سنہ میں سال کبیسہ (لوند، نسئ) از روئے قرآن کفر اور حرام ہے (القرآن ۹:۳۷) اس لئے یہ شمسی سال سے گیارہ بارہ دن کم ہوتا ہے۔ اس کے مہینوں کی تعداد تو مقرر ہے لیکن سال کے مجموعی ایام (تقریباً ۳۵۴) کے متعلق قطعیت کے ساتھ کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے[2] اسے سنہ ہلالی بھی کہتے ہیں[3] کسی ہجری سنہ سے عیسوی سنہ معلوم کرنا چاہیں تو آسان طریقہ یہ ہے کہ ہجری سنہ میں سے ۳ فی صد منہا کر کے باقی میں ۶۲۱٫۵ جمع کر دیئے جائیں تو حاصل جمع عیسوی سال ہوگا۔[4]

---

[1] لیکن حبیب الرحمن خاں صابری ۱۶ار جولائی (تقویم پارینہ) اور ۱۹ار جولائی (تقویم جدید) یعنی یکم محرم ۱ھ کو یوم المبارک جمعہ تسلیم کرتے ہیں، دیکھئے صفحہ ۵۹ فقرہ نمبر ۹۲۔

[2] برائے تفصیلات ہجری سنہ دیکھئے: رسالہ "معلومات السنین" از مولانا اساس الدین تسلیم نارنولی صفحہ ۵، ۱۶ افضل المطابع دہلی ۱۸۹۸ء میزان التواریخ صفحہ ۷، ۸ مفتاح التواریخ از سردار گوردیال سنگھ بھولا امرتسری صفحہ ۶۲ تا ۶۵ کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۵۸ء غیاث اللغات صفحہ ۳۲۴ بحوالہ عجائب البلدان بھارتیہ پراچین لپ مالا از اوجھا صفحہ ۱۹۰۔۱۹۱ Reconstruction of Islamic Chronlogy Upstr Eam Downstream از ڈاکٹر ہاشم امیر علی خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۴، ۱۹۷۸ء ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ از ڈی سی سرکار صفحہ ۸۷۔۸۸ ۳ نیز سیرت کی مختلف کتب معتبرہ۔

[3] بھولا صفحہ ۱۷۹

[4] مقالہ "علم الکتابت" از مولانا عبد الرزاق کانپوری ماہنامہ زمانہ کانپور بابت فروری ۱۹۲۸ء صفحہ ۱۳ حاشیہ نمبر ۲

عیسوی یا میلادی سنہ: عیسوی سنہ کا آغاز حضرت عیسیٰؑ کے یوم ولادت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اس سنہ کی ابتداء سے چار سے آٹھ سال پیشتر ہوئی تھی لیکن جب اس غلطی کا احساس ہوا۔ تب تک کافی تاخیر ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس کا ازالہ ممکن نہ تھا چنانچہ وہی مروج رہا۔ اگرچہ یہ سنہ دنیا میں تقریباً آٹھ سو سال بعد شارلمن معاصر خلیفہ ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ ۹۔۸۰۸ء) کے زمانہ میں رائج و مشتہر ہوا لیکن اس وقت رُبع مسکوں کے بڑے حصے میں اس کا استعمال عام ہے۔ اس سنہ کا دار و مدار گردش شمس پر ہے۔ یہ ماہ جنوری سے شروع ہو کر ماہ دسمبر پر ختم ہوتا ہے۔ سال میں تقریباً ۳۶۵ دن اور ۶ گھنٹے ہوتے ہیں لیکن ہر چوتھے سال فروری ماہ میں ایک دن کا اضافہ کر کے سال ۳۶۶ دن[۲] کا کر دیا جاتا ہے۔ جسے سال کبیسہ کہتے ہیں گویا یہ وضعی اور غیر حقیقی سال ہے۔

سنبت بکرمی: اس سنہ کی ابتداء اجین کے راجہ بکرماجیت نے اپنے سال جلوس (تخت نشینی) ۵۸ قبل از مسیح سے کی تھی۔ جسے چندر گپت ثانی (بکرماجیت ثانی م ۴۱۴ء) نے اپنے عہد میں از سر نو جاری کیا۔ یہ سنبت چیت سدی یعنی شکل پکھ (Bright Half of a Lunar Monty) سے شروع ہوتا ہے اور چیت بدی یعنی کرشن پکھ (The Dark Half of a Lunar Monty) کی انتہا پر ختم ہوتا ہے۔ پہلا ماہ چیت اور آخری پھاگن ہوتا ہے۔ چونکہ یہ بھی شمسی ہے اس لئے ہر چوتھے سال بجائے بارہ ماہ کے تیرہ ماہ کا ایک سال ہوتا ہے جسے سال کبیسہ (لوند کا سال) کہتے ہیں۔ ہندوستانی منجم اس اضافی ماہ کو "مل ماس" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کسی عیسوی سنہ میں ستاون (۵۷) شامل کر کے متوازی بکرمی سنبت معلوم کیا جاسکتا ہے اور عیسوی سنہ اس کے برعکس عمل سے۔[۳]

---

[۱] وشو کوش (ہندی) ۷: ۳۷۴ ناشر راجپال اینڈ سنز دتی، اپریل ۱۹۶۷ء

[۲] زمانہ کو ناپنے کا موزوں ترین 'واحدہ' دن ہے۔ نجومی نصف النہار سے نصف النہار تک، مسلمان غروب سے غروب تک، ہندو طلوع سے طلوع تک اور ہمہ گیر مدنی ضرورتوں میں نصف اللیل سے نصف اللیل تک کے وقفے کو "دن" مانتے ہیں۔ دیکھئے صابری صفحہ ۳۸ فقرہ ۵۹۔

[۳] بھارتیہ پراچین لپ مالا صفحہ ۱۶۵ تا ۱۷۰۔

سنہ شک یاشاکاسنبت: اس سنہ کو راجہ سالباہن نے ۷۸ھ میں شاکا قوم پر فتح حاصل کرنے کی خوشی میں سنبت ۱۳۵ بکرمی منسوخ کرکے رائج کیا۔ یعنی یہ بکرمی سنبت سے ۱۳۵ سال کم ہے۔ اس کے مہینے وہی ہیں جو بکرمی سنبت کے ہیں۔ کسی عیسوی سنہ میں سے ۷۸ خارج کرنے پر شاکاسنبت برآمد ہوجائے گا۔ اس سنبت کا سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۹ سکنڈ کا ہوتا ہے۔ کبیسہ اس میں بھی رائج ہے۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو بھارت سرکار نے ایک پریس نوٹ کے ذریعہ جدید قسم کے شاکا کیلنڈر کو ۲۲ مارچ ۱۹۵۷ء سے ملک میں جاری کیااور قومی سنبت قرار دیا۔ اس طرح اب عیسوی کیلنڈر کے ساتھ اس کی تاریخوں میں مطابقت پیدا ہوگئی ہے۔ واضح ہو کہ شک سنبت ایک عیسوی سال میں شروع ہوکر دوسرے عیسوی سال میں ختم ہوتا ہے یعنی شک سنبت ۱۹۲۱ء اپریل ۱۹۹۹ء میں شروع ہوگا اور مارچ ۲۰۰۰ میں ختم ہوگا۔[1]

سنہ الٰہی اکبر شاہی: مغل شہنشاہ اکبر نے جہاں دیگر بہت سی اصلاحات جاری کیں، ایک نئے سنہ کا آغاز بھی کیا جو سنہ الٰہی کہلاتا ہے۔ یہ اکبر کے ۲۹ویں سال یعنی ۹۹۲ ہجری مطابق ۱۵۸۴ء سے امیر فتح اللہ شیرازی نے وضع کرکے شروع کیا لیکن گذشتہ سالوں کا حساب لگاکر فی الحقیقت اسے اکبر کی تخت نشینی ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء سے تسلیم کیا گیا۔ لیکن اس کا اصل آغاز ۲۵ یوم بعد ۱۱ مارچ ۱۵۵۶ء سے کیا گیا کیونکہ اس دن ایرانیوں کا نوروز (ماہ فروردیں) تھا۔ یعنی یہ نوروزی سال ہے جو ایرانی خورشیدی جنتری پر منحصر ہے۔ اس کے دنوں اور مہینوں کے نام بھی پارسی ہیں۔ مہینے ۲۹، ۳۰، ۳۱ و ۳۲ دن کے ہوتے ہیں جیسا کہ ازروئے حساب جمل مندرجہ ذیل بیت سے معلوم ہوتا ہے:

لاولالب، لاولالاشش مہ راست
لل کط وکط لل شہور کوتہ است[2]

کسی عیسوی سنہ میں سے ۵۹۱ منہا کو دیئے جائیں تو متبادل سنہ الٰہی معلوم ہوجائے گا۔ اس

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۳ نیز "ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ (انڈین اپی گرافی) از ڈی سی سرکار صفحہ ۲۸۷-۲۸۸۔
[2] غیاث اللغات صفحہ ۳۲۵ مفتاح التواریخ صفحہ ۱۶۹۔

سنہ میں کبیسہ نہیں ہوتا۔[۱]

سنہ فصلی: سنہ فصلی شہنشاہ اکبر کے عہد میں میرزایان فارس نے راجہ ٹوڈرمل کے مشورہ سے ۱۰ر شعبان ۹۸۱ھ مطابق ۵ر دسمبر ۱۵۷۳ء کو جاری کیا۔ چونکہ لگان وصولی کا مدار اس زمانہ میں فصول شمسیہ (بکرمی سنبت) پر تھا اس لئے بجائے ہجری سنہ کے جو قمری ہے فصلی سنہ کو شمسی سال بکرمی سے تطبیق دی گئی اس طرح ۹۸۱ ہجری کو ۹۸۱ فصلی سنہ تسلیم کرلیا گیا جو بکرم سنبت ۱۶۳۰ کے مطابق تھا۔ چونکہ ۹۸۱ ہجری سنہ ۱۵۷۳ عیسوی کے متوازن تھا اس لئے کسی عیسوی سنہ میں سے ۵۹۲ کم کردیئے جائیں تو اس کے مقابل کا فصلی سنہ نکل آئے گا۔ یہ شمسی سنہ ہے اور اس کے مہینے وہی ہیں جو سنبت کے ہیں۔ اس سنہ میں سب سے پہلے میر محمد جعفر روحی رنبیر پوری[۲] (م ۱۱۵۴ھ) نے کسی کی ولادت کی تاریخ لفظ "ظہور" (۱۱۱۱ فصلی) سے برآمد کی تھی۔[۳] ورنہ اس سے پہلے صرف ہجری سنہ میں ہی تاریخیں نکالی جاتی تھیں۔

سنہ محمدی: یہ اسم بامسمیٰ سنہ ہے۔ اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت سے ہے۔ اس کا آغاز ۲۰ر مارچ ۵۷۱ء سے ہوتا ہے۔[۴] یہ بھی شمسی سال ہے۔ اس کا معمولی سال ۳۶۵ دن کا اور ہر چوتھا سال ۳۶۶ دن کا ہوتا ہے۔ اس سنہ کے مہینوں کے نام بارہ برجوں پر رکھے گئے ہیں۔ اس کے موجد مولوی نظام الدین حسن نیتوی ہیں۔ کسی عیسوی سنہ میں سے ۵۷۱ منہا کردیئے جائیں تو محمدی سنہ معلوم ہوجائے گا۔[۵] بعض شعرا نے سنہ محمدی میں بھی تاریخیں برآمد کی ہیں۔ مگر یہ سنہ رائج نہ ہوسکا۔

---

[۱] بھارتیہ پراچین لپ مالا صفحہ ۱۹۳، انڈین ایپی گرافی صفحہ ۳۸۶۔

[۲] قطعہ تاریخ وفات روحی آزاد بلگرامی نے یہ کہا:

سید نکتہ سنج حق آگاہ　　　کرد آہنگ بزم سبوحی

سال تاریخ او شود پیدا　　　وقت تکرار "جعفر روحی" ۱۱۵۴ھ (سرو آزاد ۲: ۲۰۸)

[۳] غیاث اللغات صفحہ ۳۲۲۔ ۵۷۷۷=۲x

[۴] قاضی سلمان منصور پوری ۲۲ر اپریل ۵۷۱ء بتلاتے ہیں۔ دیکھئے رحمتہ اللعالمین جلد اول صفحہ ۴۰ ناشر اعتقاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۰ء اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۲۰ر اپریل ۵۷۱ء، ۶: ۳۷۔

[۵] برائے سنہ محمدی دیکھئے رسالہ معلومات السنین صفحہ ۹ نیز غرائب الجمل صفحہ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔

سنہ اسلامی شمسی ہجری: دمشق کے عالم حسن وفقی بک نے دنیائے اسلام میں ایک نیا سال اسلامی شمسی ہجری ایجاد کیا جسے مسجد قبا[1] کا سنگ بنیاد رکھنے کے دن یعنی ۹ ربیع الاول ۱ھ سہ شنبہ مطابق ۲۱ر ستمبر ۶۲۲ء روز منگل سے شروع کیا۔[2] یہ سال شمسی ہے اور اس کے ایام سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ہوتے ہیں اور چوتھا سال جو ۴ پر پورا تقسیم ہو جائے۔ ۳۶۶ دن کا ہوتا ہے۔ اسے عیسوی سنہ سے مطابق کرنے کے لئے کسی عیسوی سنہ میں سے ۶۲۱ سال ۲۶۶ دن کم کر دیں تو اس کے متوازی اسلامی شمسی سال نکل آئے گا۔[3]

مذکورہ سنین کے علاوہ دنیا میں بعض غیر معروف سنین بھی رائج ہیں مثلاً سنہ بعثت نبوی، جو پہلی وحی نازل ہونے کی تاریخ (۱۲ر فروری ۶۱۰ء) سے شروع کیا گیا تھا مگر رائج نہ ہو سکا۔ سنہ جلالی، سنبت پارسی، سال نانک شاہی، مہدوی، بنگلہ، سنہ مشہور وغیرہ لیکن ان سنین مین تاریخیں نہیں ملتی ہیں۔ تاریخیں بالعموم ہجری، عیسوی، بکرمی اور شاکا اور فصلی سنین ہی میں کہی جاتی ہیں۔ سنبت بکرمی میں بطور مثال ایک تاریخ ملاحظہ ہو، جو منشی رام سہائے تمنا نے اردو کے مشہور ادیب رام لعل نابھوی کے پر دادا منشی گوبند رام کی وفات پر کہا تھا:

اے تمنا سال رحلت کے لئے   پیش ہاتف سر جھکا کر، کر سلام
مصرع تاریخ یہ دو بار پڑھ   رام ہی میں رم ہیں اب گوبند رام[4]

۹۸۷×۲=۱۹۷۴ بکرما

بہر حال تاریخ گو پر پابندی نہیں وہ چاہے جس سنہ میں تاریخ کہہ سکتا ہے۔ تاہم مروجہ سنین میں تاریخ کہنا بہتر ہوتا ہے اور جس سنہ میں تاریخ حاصل کرے اس کی صراحت کر دینی چاہئے۔ بغیر صراحت تاریخ میں یک گونہ نقص رہ جائے گا۔[5] (جاری)

---

[1] قبا مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے جہاں مدینہ پہنچنے سے پہلے رسول مقبول ﷺ نے ہجرت کے دوران قیام فرمایا تھا اور اسلام کی پہلی مسجد کی بنیاد رکھی تھی۔ اس مسجد کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے ملاحظہ ہو سورہ توبہ آیت نمبر ۱۰۹ (ڈکشنری آف اسلام صفحہ ۴۸۲ کالم ۲)

[2] سیرت النبی کامل ابن ہشام ۱: ۵۴۲ کا اردو ترجمہ نگار حاشیہ نمبر ۲ پر ۸ ربیع الاول روز پیر ۱ھ مطابق ۲۰ر ستمبر ۶۲۲ء بتلاتا ہے۔

[3] مقالہ "اسلامی شمسی قمری سال" از مولانا ابو الجلال ندوی مشمولہ ماہنامہ معارف بابت نومبر ۱۹۲۷ء صفحہ ۷۰-۳۷۲-۳۔

[4] ماہنامہ "نیا دور" لکھنو بابت مارچ ۱۹۹۶ء صفحہ ۲۲۔

[5] سنین کے تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ کیجئے: غرائب الجمل صفحات ۲۹۸ تا ۳۱۷ غیاث اللغات صفحہ ۳۲۱ تا ۳۲۶۔ انڈین ایپی گرافی، بھارتیہ پراچین لپ مالا (ضمیمہ) صفحہ ۱۵۹ تا ۱۹۵ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو) ۶: ۳۸-۳۷ فرہنگ آصفیہ ۳: ۱۰، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۳ رسالہ معلومات السنین اور مفتاح التقویم از صابری صفحہ ۲۲ تا ۱۶۴ ملہم تاریخ صفحہ ۵ و ۶ مفتاح التواریخ از بھولا نیز صحیفہ تواریخ از شاہ کوکب القادری صفحہ ۹ تا ۱۲۔

از مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط
اڈیٹر اخبار ''زمزم''

تیسری و آخری قسط

اسلام اور سائنس

پسپائی کا ایک نیا محاذ: یہ واضح ہو گیا کہ سائنس ''مذہب'' کے مقابلہ میں زندہ اور ترقی پذیر رہی اور مسیحیت نے عارضی فتح پانے کے بعد اس کے سامنے نہایت ذلت کے ساتھ شکست کھائی۔ سائنس نے کہا کہ علم اور ''مذہب'' کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ ''مذہب'' (مسیحیت) نے ہزیمت اُٹھانے کے بعد اعلان کیا کہ مذہب اور سائنس میں سرے سے کوئی تصادم ہی نہیں ہے! سائنس کے تجربات اپنی جگہ قائم رہے اور مسیحیت نے بالآخر انہیں تسلیم کر کے ہمیشہ کے لئے ہتھیار ڈال دیئے اور نہ صرف ہتھیار ہی ڈال دیئے بلکہ سائنس کی خاطر کتب مقدسہ کو مشکوک اور ساقط الاعتبار قرار دے دیا اور ان مضامین کو جو سائنس کے خلاف معلوم ہوتے تھے کہیں مثالی اور خیالی قرار دیا اور کہیں کہہ دیا کہ ان کا الہام سے تعلق نہیں بلکہ وہ بے سروپا روئیات ہیں جو اسرائیلیات اور خرافات سے جمع کرلی گئی ہیں! سائنس نے جن تین محاذوں سے مذاہب پر حملہ کیا تھا اس کا منشا صرف اتنا تھا کہ مسیحیت کا پورا علم کلام غلط، مشکوک اور غیر واقعی ثابت ہو جائے اور سائنس کے مشاہدات کے مقابلہ پر اس کا چراغ روشن نہ ہو سکے۔ چنانچہ سائنس کا مقصد پورا ہوا اور ''مذہب'' ہر حملہ کے بعد اپنی غلطی کا اعتراف کرتا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیت کے جس قلعہ کو ناقابل تسخیر تصور کیا جاتا تھا وہ بیت عنکوت بن کر رہ گیا۔

کنٹربری اور یارک کے بشپوں نے ۱۹۲۲ء میں ایک کمیٹی اس غرض کے لئے مقرر کی تھی کہ وہ عام مسیحی عقائد کے بارے میں تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے اور یہ بتائے کہ علمی اور تحقیقی دنیا میں کتب مقدسہ (بائبل) کی پوزیشن کیا ہے۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں کمیٹی مذکور نے اپنی رپورٹ پیش کردی اس نے اپنے فیصلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے [1]

''بائبل کو کسی اعتبار سے بھی معصوم اور غلطیوں سے مبرا قرار نہیں دیا جاسکتا انجیل کامل کتاب نہیں ہے وہ صرف مسیح کے سوانح حیات پر مشتمل ہے جو عرصہ گزر جانے کے

بعد مختلف ہاتھوں سے قلم بند کئے گئے ہیں۔ ولادت مسیح کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ ناقابل اعتبار اور غیر معقول ہے۔ مرنے کے بعد مسیح کا دوبارہ جی اٹھنا بھی سر تا سر غلط ہے۔ مسیح کا صلیب پر چڑھ جانا بھی معتبر ذرائع سے ثابت نہیں اور یہ واقعہ کبھی معرض ظہور میں نہیں آیا۔ غرض انجیل میں مسیح کی صلیب دیئے جانے اور مردوں میں سے جی اٹھنے کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ واقعہ کے خلاف ہے۔ کتاب پیدائش میں تخلیق کائنات کی جو صورت پیش کی گئی ہے اس پر گو کوئی اعتراض نہ ہو مگر تعلیم یافتہ مسیحیوں کا خیال ہے کہ صرف خرافاتی افسانہ ہے اور ان کے لئے اس کی حیثیت بس اتنی ہی ہے کہ یہ افسانہ کتاب پیدائش میں درج ہے جو تاریخی واقعہ سے کلی منافات رکھتا ہے۔" [1]

فرمایئے! سائنس کا منشا اس سے زیادہ اور کیا تھا کہ کتب مقدسہ غیر الہامی۔ غیر واقعی اور غلط ثابت ہو جائیں۔ وہ خود اپنی جگہ کوہ استقامت بن کر کھڑی رہی اور مسیحیت نے اپنی گردن اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر پھینک دی! یہ ہے "مذہب" اور سائنس کا تصادم و معرکہ جسے غلطی سے اسلام اور سائنس کا معرکہ سمجھ لیا گیا ہے۔

کلیسا کے فیصلے: اگرچہ سطور محولہ بالا سے ہمارا مقصد بالکل واضح ہو گیا ہے مگر سائنس کے مقابلہ میں چونکہ مسیحیت کی شکست کی داستان نہایت دلچسپ ہے اس لئے ہم سائنس کے خلاف کلیسا اور پوپ کے فیصلوں اور عدالتی کارروائیوں پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جن سے ثابت ہو گا کہ مسیحیت کی شکست ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار وانحراف کی مسیحی دنیا کو جرأت نہیں ہو سکتی اس داستان سرائی سے بھی ہمارا مقصد بس یہی ہے کہ سائنس کے مقابلہ پر مسیحیت نے شکست کھائی اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے علوم و حقائق اور جدید انکشافات کو آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقعہ دیا۔

گلیلیو کو پاپائے روم کے حکم سے اس بنا پر گرفتار کیا گیا کہ اس کی تحقیق کے مطابق آفتاب مرکز کائنات ہے اور زمین دیگر سیاروں کی طرح ان کی گرد گھومتی ہے۔ ۱۶۱۵ء میں گلیلیو کو روم کی مذہبی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور قبل اس کے کہ تحقیقات شروع ہو اور اس فلکی کو اس کے

---

[1] رپوٹر کا تار مندرجہ اسٹیٹسمین مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۸ء و بمبئی کرانیکل مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۸ء و ہندوستان ٹائمز (دہلی) مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۸ء منہ ۱۲

جرم کی سزا ملے، محکمہ احتساب کے ارکان کو ہدایت کی گئی کہ وہ گلیلیو کے ان نظریات کی چھان بین کرے جن پر اس کی کتاب مشتمل ہے۔ چنانچہ مقدس ارکان نے ایک ماہ کی تحقیقات کے بعد ذیل کا فیصلہ صادر فرمایا:

"پہلا قضیہ کہ آفتاب مرکز کائنات ہے اور وہ زمین کے گرد گردش نہیں کرتا بداہت کے خلاف اور لاہوتی قضایا کے منافی ہے اور چونکہ کتاب مقدس (توراۃ) کے بھی خلاف ہے اس لئے وہ بدعت ہے۔

دوسرا قضیہ کہ زمین کائنات نہیں ہے اور وہ آفتاب کے گرد گھومتی ہے بداہت اور فلسفہ (؟) کے خلاف ہے اور معتقدات صحیح سے کلی منافات رکھتا ہے۔" [۱]

اس فیصلہ کے بعد پوپ پولوس خاص نے پھر حکم دیا کہ گلیلیو کو محکمہ احتساب کے سامنے جواب دہی کے لئے پیش کیا جائے اگر وہ اپنی رائے فاسد سے رجوع نہ کرے تو اسے زندان میں محبوس کرکے طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا جائے۔ چنانچہ محکمہ احتساب کے جج بیلارمن (Bellarman) نے گلیلیو کو ہدایت کی کہ وہ اپنی غلطی کا کھلے الفاظ میں اعتراف کرے اور مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنا توبہ نامہ محکمہ احتساب کے سامنے پیش کردے۔

"میں مقدس پوپ اور ان کے احکام کے نام پر اس اعتقاد سے کہ آفتاب مرکز کائنات ہے اور غیر متحرک ہے اور زمین حرکت کرتی ہے خلوص دل سے توبہ کرتا ہوں۔ میں اپنی رائے کسی کے سامنے پیش نہیں کروں گا اور تحریری و تقریری طور پر اس کی اشاعت سے محترز رہوں گا۔" [۲]

۱۶۶۴ء میں پوپ الگزنڈر اسابع نے کوپرنیکس اور گلیلیو کی کتاب کو اس سیاہ فہرست میں جگہ دی جس میں کتاب مقدسہ کے خلاف تحریرات کو درج کرکے ان پر حرمت کا فتویٰ لگایا جاتا ہے۔

پوپ کلیسا اور محکمہ تفتیش نے کوپرنیکس اور گلیلیو پر جو الزامات عائد کئے تھے ان میں صاف تصریح موجود ہے کہ ان ملحدین کے خیالات و نظریات نصوص توراۃ اور کلیسائی معتقدات کے

---

[۱] ڈکن وائٹ "Between Religion And Knowlege" فصل ۳ صفحہ ۶۹

[۲] ڈکن وائٹ "Between Religion And Knowlege" فصل ۳ صفحہ ۶۹

خلاف ہیں اور اس لئے ان کی کتابوں کو خلاف مذہب اور ان ملحدین کو منکرین مذہب قرار دیا جاتا ہے۔

ذرا ان فیصلوں اور فتووں کا زور دیکھئے اور پھر "مذہب" کی پسپائی اور سائنس کی فتح مبین بھی ملاحظہ فرمایئے! سترہویں صدی میں خود پادریوں نے پوپ اور کلیسا کے فیصلوں میں تاویلیں شروع کر دیں اور دنیا کو یہ کہہ کر دھوکہ دینے کی کوشش کی کہ ان فیصلوں کا مذہب اور توراۃ سے کوئی تعلق نہ تھا!

تاویلیں: اس باب میں اربابِ "مذہب" نے پہلی تاویل یہ کی کہ گلیلیو کو اس لئے سزا نہیں دی گئی تھی کہ وہ زمین کی حرکت کا قائل تھا وہ پاپائیت کی بارگاہ میں اس لئے معتوب ہوا کہ اس نے اپنے نظریہ کو توراۃ سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی! اگر فقر ڈیکان کی خفیہ دستاویز اور مذہبی فیصلے یورپ کے اہل علم نے شائع نہ کر دیئے ہوتے تو شاید یہ تاویل کچھ مدت کے لئے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر دیتی مگر ان کی اشاعت کے بعد اس قسم کی بات بنانا اس جماعت کا کام ہو سکتا ہے جو اپنے حریف سے ذلت کے ساتھ شکست کھا چکی ہو! محکمہ احتساب کے فیصلہ میں صاف لکھا ہے کہ دوران ارض کا نظریہ اس لئے باطل ہے کہ وہ نصوص توراۃ کے منافی ہے گلیلیو سے جن الفاظ میں توبہ کرائی گئی اس کا منشا بھی یہی تھا کہ حرکت زمین کا نظریہ مذہبی معتقدات کے منافی ہے! مگر سترھویں صدی میں جب پادریوں کو ندامت دامن گیر ہوئی اور علمی انکشافات کے سامنے مذہب کی دال گلتی نظر نہ آئی تو یہ تاویل گھڑی کہ گلیلیو اپنے نظریات کو کتب مقدسہ سے ثابت کرنا چاہتا تھا۔

ارکانِ مذہب نے جب دیکھا کہ محکمہ احتساب کے خوفناک فیصلے منظر عام پر آگئے ہیں اور ان کے سامنے اس قسم کی تاویل شکست کا کھلا اعتراف ہے تو انہوں نے ایک دوسری ہی تاویل گھڑ ڈالی۔ انہوں نے فرمایا کہ گلیلیو کو اس لئے سزا دی گئی تھی کہ اس کے دل میں پوپ کا احترام نہ تھا۔ گویا گلیلیو کا معاملہ ذاتی معاملہ تھا مذہب اور علم کی جنگ نہ تھی! ظاہر ہے کہ یہ تاویل بھی اعتراف شکست کے مترادف ہے جن پر آنے والی نسلوں کو دل کھول کر ہنسنے اور مذاق اڑانے کا موقعہ ملا۔

اس سلسلہ میں تیسری تاویل بھی قابل ملاحظہ ہے اس میں فرمایا گیا ہے کہ گلیلیو کو پوپ یا کلیسا کے حکم سے نہیں بلکہ محکمہ احتساب کے حکم سے سزا دی گئی تھی اور پوپ اور کلیسا کو اس کے فیصلوں کی خبر تک نہ تھی! مطلب یہ ہے کہ یہ معرکہ علم اور مذہب کے درمیان نہ تھا بلکہ علم اور محکمہ عدالت کے درمیان تھا۔ جس سے کلیسا کو کوئی تعلق نہیں! حالانکہ سولہویں اور سترہویں صدی کے تمام اکابر کلیسا نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ گلیلیو کے خلاف فیصلہ کی قرارداد پوپ اور کلیسا کے نام سے مرتب کی گئی تھی۔ خود پوپ اربن ہشتم نے اعلان کیا تھا کہ ۱۶۱۶ء کا فیصلہ پولومس فامس اور کلیسا کے حکم سے صادر کیا گیا تھا اور ۱۶۳۳ء کے فیصلہ میں اس کا اور کلیسا دونوں کا ہاتھ تھا۔ اسی طرح پوپ الگزنڈر ہفتم نے کئی بار اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ۱۶۶۴ء کا فیصلہ خود اس کے حکم سے صادر کیا گیا تھا!

آخر ان تاویلات کی پول بھی کیتھولک پادری کو کھولنی پڑی۔ ریورنڈر ابرٹس نے قصر ڈیکان کے فیصلوں کو شائع کرتے ہوئے اعلان کیا۔

> "وقت آگیا ہے کہ کھینچا تانی کے بغیر حق کا اعتراف کرلیا جائے کیونکہ حقائق ظاہر ہونے کے بعد دروغ بافیوں اور فریب کاریوں کا بازار سرد پڑ جائے گا حقیقت یہ ہے کہ پوپوں کی سلطنت اور کلیسا کے اقتدار نے حرکت زمین کے خلاف تمام جائز اور ناجائز طریقے استعمال کئے، ہم آج کلیسا کے فیصلوں کی موجودگی میں شرم و ندامت کے مارے سر بھی نہیں اٹھا سکتے۔"[1]

ایک طرف مقام عصمت (پاپائیت) اور اس کے فیصلے ہیں۔ دوسری طرف ندامت ہے۔ تاویلیں ہیں اور سائنس کھڑی ہنس رہی ہے کہ آخر مذہب نے چار و ناچار اپنی شکست کا اعتراف کرہی لیا اور کلیسا کو سائنس کے مقابلہ پر ہتھیار ڈالتے ہی بنی!

جس وقت کھلے طور پر اعتراف کرلیا گیا کہ علم کی مخالفت کی ذمہ داری تمام تر پوپوں کے سر عائد ہوتی ہے تو ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ پوپ کا مقام تو عصمت اور بیگناہی کا مقام ہے پھر انہوں نے کیوں غلط فیصلے صادر کئے اور علم کی مخالفت کرکے کیوں کلیسا کو ذلیل و رسوا کیا؟ یہ

---

[1] ڈکسن وائٹ کی کتاب "مذہب و علم کا معرکہ" صفحہ ۱۱۸۔ ۱۲

سوال پیدا ہوتے ہی کیتھولک حلقوں کا ایمان متزلزل ہو گیا اور پوپ کی عصمت کو ایسا دھکا لگا کہ اسے پھر سنبھلنے کا موقعہ نہ ملا اور سائنس کو اس راہ سے بھی زبردست کامیابی حاصل ہوئی!

انگلستان کا کارنامہ: اس ذیل میں ہم انگلستان کی عدالتوں کے چند فیصلوں پر بھی نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علم کو اپنی جگہ سے کبھی ہلنے کا موقعہ نہ ملا مذہب نے ہر قدم پر ٹھوکر کھائی اور ہر محاذ پر اسے شکست اٹھانی پڑی۔ اور شکست کا سوال پیدا ہی وہاں ہو سکتا ہے جہاں دو طاقتوں میں تصادم ہو، لہٰذا مسیحیت اور علم کا تصادم ہوا اور مسیحیت نے اپنے حریف کے مقابلہ پر ہزیمت اٹھائی۔ اسلام نہ کبھی مقابلہ پر آیا اور نہ شکست کا سوال پیدا ہوا۔ معرکہ ہوا مسیحیت اور علم کے درمیان جس میں مسیحیت پسپا ہوئی اور سائنس نے فتح و کامرانی حاصل کی۔

انگلستان میں ۱۳۲۸ء سے ۱۹۱۲ء تک قانون الحاد و ارتداد کے ماتحت جس قدر مقدمات آزاد خیال علماء پر چلائے گئے اور جس بے دردی کے ساتھ انہیں سنگین اور شدید سزائیں دی گئیں اس کی نظیر شاید کسی دوسرے ملک میں تلاش کرنے پر بھی نہ ملے گی۔ ۱۹۱۲ء کے بعد جب قانون الحاد کی تنسیخ عمل میں آئی اور ضمیر کی آزادی کا اعلان ہوا تو کہیں جا کر علماء و حکماء نے اطمینان کا سانس لیا۔ قانون الحاد کے ماتحت جس قدر بھی مقدمات چلائے گئے اور عہد بہ عہد ججوں نے شرمندہ ہو کر جو قلا بازیاں کھائیں ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علم و سائنس نے "مذہب" کو کس ذلت کے ساتھ شکست دی ہے اور مسیحیت اپنی غلطیوں کا احساس کر کے کس طرح علم و حکمت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئی ہے!

۱۶۷۶ء میں ایک شخص ٹیلر کے خلاف سر میتھو ہیل کی عدالت میں قانون الحاد کے ماتحت مقدمہ چلایا گیا۔ ٹیلر کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے حضرت مسیح اور انجیل مقدس کی شان میں گستاخی کی تھی اور دانستہ قانون الحاد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے الحاد و زندقہ کی راہ پر قدم مارا تھا۔ فاضل جج سر ہیل نے ملزم کو سزا دیتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا:

> "ملزم نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ نہ صرف ملحدانہ اور مفسدانہ ہیں بلکہ قانون اور حکومت کے بھی خلاف ہیں اور اس لئے ملزم اس قابل ہے کہ اسے عبرتناک سزا دی جائے۔
>
> انگلستان کا قانون مسیحی قانون ہے اور مسیحیت کی حمایت اس قانون کا منشا ہے۔ ملزم کی رائے

چونکہ مسیحی عقائد و مسلمات کے منافی ہے اس لئے وہ قابل سزا ہے۔" [1]

اس واقعہ سے ٹھیک پچاس سال بعد ۱۷۲۹ء میں تھامس دولسٹن کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے انجیل کی بعض آیات کی ایسی تشریح کی ہے جو سر تا سر ملحدانہ ہے۔ چنانچہ اس پر لارڈ ریمانڈ کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور فاضل جج نے ملزم کو مجرم گردانتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ چونکہ انگلستان کا قانون مسیحی قانون ہے اس لیے ملزم کو سزا ضرور ملنی چاہیئے۔ [2]

اس طرح ۱۷۴۵ء میں ایک یہودی کے خلاف اس بنا پر مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے تورات کی تعلیم کے لیے بارہ سو پونڈ وقف کر دیئے تھے! فاضل جج لارڈ ڈیک نے اپنے فیصلہ میں لکھا۔

"بارہ سو پونڈ کا وقف، مسیحی مذہب برداشت نہیں کر سکتا۔ اس وقف سے یہودیت کی اشاعت کی جائے گی اور چونکہ انگلستان کا قانون خدائی قانون ہے لہٰذا ملزم قابل سزا ہے۔" [3]

غرض ۱۶۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک قانون الحاد کے تحت جس قدر مقدمات عدالتوں میں دائر ہوئے ان سب میں فاضل ججوں نے دو باتوں کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا۔

(۱) انگلستان کا قانون مسیحی اور خدائی قانون ہے اور اس کی خلاف ورزی مسیحیت سے انحراف کے مرادف ہے۔

(۲) ملزموں کی رائے عقیدہ، مسیحی تعلیم کے خلاف ہے لہٰذا وہ ملحد اور قابل سزا ہیں۔

عدالتوں کے فیصلے: سائنس اور علم کو چونکہ مظفر و منصور ہونا تھا اس لئے انگلستان کے مذہبی اور قانونی فیصلوں میں تغیر رونما ہوا اور مذہب نے شکست کھانے کے لئے تیاری شروع کر دی۔

۱۸۸۳ء میں تین اشخاص بریڈلا۔ فوٹ اور ریمزے کے خلاف اس الزام میں مقدمہ چلا گیا کہ انہوں نے اخبار "فری تھنکر" میں چند ملحدانہ مضامین شائع کئے تھے مقدمہ کی سماعت کوئینز بنچ میں لارڈ چیف جسٹس کالرتج (Coleridge) نے کی۔ لارڈ موصوف پر زمانہ کا اثر پڑ چکا تھا وہ سمجھتے تھے کہ کہ آزادی رائے پر قانون الحاد کے ماتحت مقدمات کی سماعت نہ صرف ان کی شان

---

[1] ایچ بریڈ ابونر "Penalties Up0n Opinion" صفحہ ۳۱
[2] ,, ,, ,, ,, ,, صفحہ ۳۴
[3] ,, ,, ,, ,, ,, صفحہ ۳۵

کے خلاف ہے بلکہ کلیسا اور مسیحی نظام کے لئے روسیاہی کا موجب بھی ہے۔ آپ نے سرکاری وکیل کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ ایک مسیحی مذہب کا منکر (مثلاً یہودی) عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر قانون الحاد کے ماتحت ملحدین کو سزا دے سکتا ہے حالانکہ سزا دینے والا خود مسیحیت کا منکر ہے! کیا قانون الحاد کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور تضحیک ہو سکتی ہے۔" [1]

آخر طول طویل بحث و تمحیص کے بعد فاضل جج نے تسلیم کیا کہ ملزمین قابل سزا ہیں اس لئے نہیں کہ انہوں نے ملحدانہ مضامین شائع کئے بلکہ اس لئے کہ ان کی اشاعت کا طریقہ غلط تھا! یعنی قانون الحاد کی زد میں طریقہ (Manner) آتا ہے۔ نفس مضمون (Matter) نہیں آتا!

۱۹۰۸ء میں ایک شخص ہنری بولٹر کے خلاف ہائی بری کورنر میں ملحدانہ تقریر کرنے کے خلاف جسٹس فلی مور کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں تھامس ولیم اسٹوراٹ کے خلاف وکٹوریہ اسکوائر میں زندیقانہ تقریر کرنے کے الزام میں جسٹس ہورج کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اسی طرح ۱۹۱۲ء میں مسٹر اسٹیفسن کے خلاف کالج اسکوائر میں تقریر کرنے کے جرم میں استغاثہ دائر کیا گیا جس کی سماعت جسٹس ایلڈن ہنکس نے کی ان تین مشہور مقدمات میں فاضل ججوں نے ملزموں کے خلاف فیصلہ صادر کرتے ہوئے اعلان کیا۔

"ایک شخص مذہب پر حملہ کرتے ہوئے بھی جرم الحاد کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ضروری نہیں کہ جو شخص مذہب کے بعض نظریات پر حملہ آور ہو وہ ملحد بھی ہو اور اس پر قانون الحاد کے ماتحت مقدمہ بھی چلایا جائے۔ جو شخص مذہبی معاملات میں آزادی کے ساتھ گفتگو کرنے کا مجاز و حقدار ہے۔ البتہ اسے اپنی حدود متعین کر لینی چاہئیں اور اسے اس مقام کو فراموش نہ کر دینا چاہئے جہاں وہ گفتگو کر رہا ہے اور نہ ان سامعین کو نظر انداز کرنا چاہئے جن کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا امکان ہے۔" [2]

غور فرمائیے کہ علم و حکمت سے مرعوبیت اور مذہب کی شکست کا یہ کتنا عبرتناک نظارہ ہے

---

[1] "Penalties Upon Opinion" صفحہ ۱۰۳

[2] "Penalties Up0n Opinion" صفحہ ۱۲۲

کہ انگلستان کی عدالتوں کے فاضل جج قانون الحاد کو شرمندگی اور ندامت کے ساتھ استعمال فرمارہے ہیں۔

(۱)۱۶۷۶ء میں سر ہیل نے ۱۷۲۸ءو ۱۷۴۵ء میں تھامس ووسٹن اور لارڈ ہارویک نے اپنے فیصلوں میں لکھا کہ چونکہ ملزم کی رائے اور عقیدہ مسیحی تعلیم کے خلاف ہے لہٰذا وہ قابل سزا ہے۔

(۲) ۱۸۸۳ء میں جسٹس کالرتج نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے پہلی بار انگلستان کو آگاہ کیا کہ قانون الحاد کے ماتحت ملزم کو سزا اس لئے دی جاتی ہے کہ اس نے اظہار رائے کے لئے غلط طریقہ استعمال کیا تھا(اس لئے سزا نہیں دی گئی کہ اس کی رائے مذہب کے خلاف تھی۔)

(۳)۱۹۰۸ء۔ ۱۹۱۱ءاور ۱۹۱۲ء میں جسٹس فلی مور جسٹس ہورج اور جسٹس ایلڈن بنکس نے یہ فیصلے صادر فرمائے کہ نہ تو مذہب کے خلاف کسی رائے کا اختیار کرنا جرم ہے اور نہ کسی خاص طریقہ سے اظہار رائے خلاف قانون ہے بلکہ اصل جرم یہ ہے کہ مقام اور ماحول کو نظر انداز کردیا جائے!

گویا پہلے رائے اور خیال کو جرم قرار دیا گیا پھر آزادی رائے کو طریقہ کی طرف منتقل کیا گیا اور آخر میں طریقہ کو بھی مقام اور ماحول میں تبدیل کردیا گیا! یہ سب کچھ علم وحکمت اور ضمیر کی آزادی کی خاطر ہوا اور اس طرح سائنس کو کامیابی اور فتح مندی حاصل ہوئی اور مسیحیت کو ہزیمت اور شکست اٹھانی پڑی!

نتائج: اگرچہ یہ بحث ابھی تشنۂ تکمیل ہے مگر اس حقیقت کی جانچ پڑتال کے لئے کافی ہے کہ مذہب اور سائنس میں معرکہ سے مراد مسیحیت اور سائنس کا تصادم ہے اسلام اور سائنس کی جنگ نہیں ہے کیونکہ

(۱) مسیحیت اور کلیسا نے ہی علوم واکتشافات کا مقابلہ کیا اور انہیں کتب مقدسہ کے منافی قرار دیا۔

(۲) یورپ کے علماء اور محققین نے علم کے ہر شعبہ پر بحث کرتے ہوئے مسیحیت اور اس کے عقائد ورسوم پر ضرب لگائی اور صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ سائنس مسیحیت کے جہل اور کلیسا کے جمود کا ردعمل ہے۔

(۳) پوپ اور کلیسا اور محکمہ احتساب ہی نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں علماء وحکماء کو قتل کیا یا زندہ جلایا اور ہزاروں کی جانیں شکنجوں میں کس کر نکالیں۔

(۴)علم ودانش اور سائنس وانکشافات اپنی جگہ پر قائم رہے اور مسیحیت کو ان کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی۔ مسیحیت نے سائنس کے مقابلہ پر شکست کا اعتراف کیا اور اس کے لئے تین طریقے اختیار کئے۔

(ا)سائنس اور مسیحیت میں کوئی معرکہ اور تصادم نہیں ہے حالانکہ سائنس آج بھی پکار کر اعلان کررہی ہے کہ "مذہب" اور سائنس میں کبھی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ بقول اے۔ این وائٹ ہیڈ۔ یاتومذہب کو سائنس کے لئے جگہ خالی کرنی پڑے گی یا سائنس مذہب کے مقابلہ پر فنا ہوجائے گا(ب) رجال مذہب اور کتب مقدسہ کے حاملین نے سائنس کے ان ہی نظریات کو تسلیم کرلیا جن کی بنا پر یہ سارا طوفان کھڑا کیا گیا تھا۔(ج) سائنس کی خاطر کتب مقدسہ میں تاویلیں کی گئیں اور سائنس کے خلاف جو باتیں نظر آئیں انہیں تمثیلی حقائق سے تعبیر کیا۔اس کے بعد اعلان کردیا گیا کہ تورات اور دیگر صحائف کی داستانیں افواہوں پر مبنی ہیں۔ تاریخی عنصر ان میں بہت کم ہے۔ متعدد صحائف کو جعلی اور بیشتر حصص کو الحاقی تسلیم کیا گیا۔

(۵)پوپوں، کلیساؤں اور محکمہ احتساب کی ظالمانہ اور جاہلانہ کارگزاریوں پر پردہ ڈالا گیا اور ندامت کے باعث حقائق کو چھپایا گیا ان میں تاویلیں کرنے کی کوشش کی گئی۔

(۶)عدالتوں کے ظالمانہ فیصلوں نے ہزاروں کو محبوس زنداں بنایا اور پھر سائنس کی خاطر فیصلوں اور دلیلوں کا رُخ پھیر دیا گیا۔

اب بتاؤ کہ مندرجہ بالا دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی اسلام کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے؟ان امور میں سے کسی ایک امر کے لئے بھی اسلام اور مسلمانوں کو ذمہ دار گردانا جاسکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس خیال کی غلطی خود بخود آشکارا ہوجاتی ہے کہ مذہب اور سائنس کے معرکہ میں اسلام بھی شریک ہے! رہا یہ سوال کہ سائنس کے بہت سے نظریات اسلامی عقائد وحقائق کے خلاف ہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ نہیں اگر سائنس نام ہے واقعات اور مشاہدات کا جو حق اور یقین پر مبنی ہو تو ایک مسئلہ کا نام لو جو اسلام کے کسی مسئلہ سے متصادم ہوتا ہو۔ قران کریم کتاب فطرت ہے اور سائنس اس کا عملی تجربہ اور ظاہر ہے کہ تجربات ومشاہدات کا تصادم فطرت کے حقائق سے نہیں ہوسکتا۔

دربار اکبری کا ملک الشعراء..... فیضی

(بقلم ڈاکٹر محمد امین عامر، جز وقتی لکچرر شعبۂ فارسی مولانا آزاد کالج کلکتہ)

ہندوستان میں مغل سلطنت جو بابر سے اورنگ زیب تک کم و بیش پونے دو صدی کا زمانہ احاطہ کرتی ہے، فارسی زبان و ادب کی ترقی اور اہل علم کی سرپرستی کے لحاظ سے جس دور کو ممتاز اور منفرد حیثیت سے پیش کرتی ہے وہ اکبر کا ۴۹ سالہ عہد ہے جو ہندوستان میں فارسی ادبیات کا "عہد زرّیں" کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس عہد میں فارسی ادب اور دیگر علوم و فنون پر جو گراں قدر اور کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے اُسے اکبر ہی کے فطری علمی مذاق اور جود و سخا سے عبارت کرنا زیادہ موزوں و مناسب ہوگا۔ اکبر گرچہ اُمّی تھا مگر قدرتی طور پر اُسے علم وادب اور شعر و سخن سے جو گہری وابستگی تھی وہ اُسے شعر فہمی کے علاوہ شعر گوئی سے بھی باز نہ رکھ سکی۔ ذیل کے اشعار جو تاریخوں میں اُس سے منسوب کیئے جاتے ہیں اس کی حسین طبیعت کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

دوشینہ بہ کوئی مَی فروشاں
پیمانۂ مَی بہ زر خریدم
اکنوں ز خمار سر گرانم
زر دادم و دردِ سر خریدم

"کہتا ہے کہ رات مَے فروشوں کی گلی میں جاکر انہیں میں نے پیسے دیئے اور شراب کا پیالہ خریدا۔ شراب جو پی تو مستی اتنی چڑھی کہ سر بھاری ہو گیا اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے پیسے دے کر دردِ سر مول لے لیا۔"

اکبر جو عظیم الشان سلطنت کا مالک تھا اور جس کی مدت حکومت ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء تقریباً نصف صدی پر مشتمل ہے، علم و ہنر اور سخن پروری کے سبب مغل تاریخ میں سب سے نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اہل علم و کمال کی قدر دانی، غریب الوطن حکماء اور شعراء کی سرپرستی نے نہ

صرف یہ کہ علم و ادب کے نور کو جگمگادیا بلکہ اس کے خیرہ ساز جگمگاہٹ سے پورا ایشیاء روشن اور منور تھا۔ اس زمانے میں دربار اکبری سے منسلک ایسے علماء و فضلاء اور دانشوران موجود تھے جنہوں نے تاریخ، حکمت، فلسفہ، تفسیر، فقہ، نجوم، سیاسیات اور مختلف علوم و فنون پر بیش بہا کتابیں تصنیف کیں اور جن کے دم سے اکبر کی دلچسپیوں اور مساعی کو شرف قبولیت عطا ہوئی۔ ان علماء و فضلاء میں قابل ذکر نام مُلا عبد القادر بدایونی، عبدالرحیم خانخانان، خواجہ نظام الدین بخشی، ابو الفضل، فیضی، حکیم ابو الفتح گیلانی اور شیخ مبارک ناگوری کے لئے جاسکتے ہیں، جنہوں نے اپنی گراں قدر تصنیفات مثلاً کتاب الاحادیث، تزک بابری کا ترکی سے فارسی ترجمہ، طبقات اکبری، آئینِ اکبری، اکبر نامہ، بحر الاسمار، معجم البلدان، سواطع الالہام، موارد الکلم وغیرہ فارسی ادب میں بحر ذخار کی حیثیت سے رکھ چھوڑی ہیں۔ درباری علماء و فضلاء کے علاوہ علم و فضل کے ایسے درخشاں ستارے بھی موجود تھے جنہوں نے دربار اکبری سے غیر متعلق رہ کر اعلیٰ علمی و اخلاقی تصنیفات انجام دیں۔ ان مایہ ناز دینی و روحانی ہستیوں میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ اور مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطانپوریؒ کے اسمائے گرامی اسلامی تاریخ کے زریں باب میں تاقیامت ثبت رہیں گے۔ غرضیکہ اکبر کا زمانہ فارسی علم و ادب کی آبیاری اور عروج کا زمانہ تھا اور پروفیسر ایتھے (ETHE) کے شاعرانہ خیال میں اکبر کا عہد علم و ادب کی پیش رفت کے ضمن میں "ہندی فصل بہار" سے عبارت ہے۔

یوں تو اکبر کا دربار ایک اچھا خاصا بیت العلم تھا جو علماء، فضلاء، دانشوران، شعراء، حکماء اور دیگر ماہرین علوم و فنون کا مرکز کہلاتا تھا لیکن یہ علمی انجمن، جس نے دفعتاً دربار اکبری کو جگمگادیا اور مغل اعظم کا نام ساری دنیا میں چمکادیا دو مفخر زماں اور نامور ہستیوں کے تذکرے کے بغیر ضوفشانی کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ ان میں ایک نام ابو الفضل اور دوسرا فیضی کا لیا جاسکتا ہے جن پر بادشاہ اور اعیان مملکت کو بجا طور پر فخر تھا۔ ان سطور میں ابو الفضل کے بجائے فیضی کے تعلق سے ہی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

بقول علامہ شبلی نعمانی "فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص ہی پیدا کیے جن کو اہل زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا..... خسرو اور فیضی۔" علامہ شبلی نعمانی کے گرانقدر خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عہد

سلاطین میں امیر خسرو کے علاوہ کوئی ایسا فنکار نہ تھا جس نے خسرو پر سبقت حاصل کی ہو۔ اسی طرح عہدِ مغلیہ میں فیضی کے ہم پلہ کوئی اور نہ تھا جسے وہ شہرت اور مقام دیا گیا ہو جو فیضی کو حاصل تھا۔ یہ فیضی ہی کی شاعرانہ عظمت کا جادو تھا جس نے ایران کے مشہور شاعر علی نقی کمرہ کو فیضی کی مدح میں ۱۳۵ اشعار پر مشتمل ایک طویل قصیدہ اصفہان سے لکھ کر ہندوستان فیضی کی خدمت میں ارسال کرنے پر مجبور کیا۔ قصیدہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں: ع

مرا افگند بر نظم امورم چو تو فیضی
ابو الفیض آن گزینِ اکبر و شیخ کبیر من
اگر ہستم مجیر اندر سخن او ہست خاقانی
وگر من مستجیر آستانِ او مجیر من
کیم با او رسد در شاعری دعوای ہمچشمی
کہ در ایں خانقاہم من مرید اوست پیر من

ایرانی شاعر نے فیضی کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کی شاعرانہ عظمت کو نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا ہے بلکہ اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ شاعری میں فیضی کے مدمقابل کوئی نہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس سے اپنی قلبی ارادت کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنا مرشد بھی تسلیم کیا ہے۔

مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی، جو فیضی کے ہمعصر اور دربار اکبری سے منسلک تھے فیضی سے حد درجہ دشمنی رکھنے کے باوجود اُس کے علمی کمالات کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروج و قافیہ و تاریخ ولغت و طب و انشاء عدیل در روزگار نہ داشت۔"

غرض کہ فیضی دربار اکبری کا سب سے نامور عالم، انشاء پرداز، حکیم، بلند پایہ خطیب وشاعر، عربی، فارسی و سنسکرت زبانوں کا ماہر، تاریخ، فلسفہ اور دینیات کا عظیم ترین اسکالر تھا۔ مگر وہ ان گوناگوں صفات وکمالات کے متحمل ہونے کے باوجود صرف شاعر ہی کی حیثیت سے معروف جہاں تھا، اور اس کے بقیہ اوصاف پر پردے پڑے رہے۔ غالبًا اس کو شدت سے

اس بات کا احساس تھا جبھی تو کہتا ہے: ع

امروز نہ شاعرم نہ حکیم
دانندۂ حادث و قدیم

فیضی کا اصل نام شیخ ابوالفضل تھا اور فیضی اور فیاضی اس کے دو تخلص تھے۔ وہ عربی النسل تھا اور اس کے اسلاف یمن کے باشندہ تھے۔ دسویں صدی ہجری میں فیضی کے دادا خضر وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور یہاں ناگور میں سکونت اختیار کی۔ یہیں انہوں نے ایک عربی خاندان میں شادی کی جس سے شیخ مبارک تولد ہوئے۔ شیخ مبارک اپنے زمانے کے عظیم المرتبت انسان تھے۔ انہیں علوم ظاہری اور باطنی دونوں پر عبور حاصل تھا۔ چار جلدوں میں تفسیر کبیر کے انداز پر ایک تفسیر لکھی جس کا نام "منبع العیون" رکھا۔ شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور پھر آگرہ آئے۔ جمنا کے کنارے میر رفیع الدین حسینی کے ہمسایہ میں قیام اختیار کیا اور یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی۔ خدا نے کثیر العیال بنایا جس میں سب سے اول فیضی تھا۔ ۹۵۴ ہجری میں فیضی کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی اور انتہائی تعلیم اپنے والد بزرگوار شیخ مبارک ناگوری سے حاصل کی اور شاعری میں خواجہ حسین مروی جو دینیات، شاعری، انشاء پردازی، حسن تقریر اور ظرافت و لطیفہ گوئی میں کمال رکھتے تھے، کا تربیت یافتہ تھا۔ عالم شباب میں فیضی اپنے کمالات کے جوہر دکھا رہا تھا اور اپنے شاعرانہ فن کی بدولت بامِ عروج پر پہونچا ہی تھا کہ قسمت نے اُسے گردشِ روزگار کا اسیر بنائے رکھا۔ اس کے ایام مصائب کی سرگذشت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ اس کے پدر بزرگوار شیخ مبارک ناگوری کے عہد میں مہدوی نام کا ایک فرقہ تھا جس پر چاروں طرف سے بندگانِ خدا کی لعنت و پھٹکار اور ذلت و ملامت کی بارش ہو رہی تھی۔ شیخ مبارک جو نہایت خلیق اور پاکیزہ طبیعت کے انسان تھے شیعہ، سنی، مسلمان، کافر غرضیکہ ہر طبقۂ عوام سے ان کی ملاقات اور گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ مہدوی فرقہ سے بھی وہ انسانی اخوت اور اخلاقی تقاضے کے تحت ملا کرتے تھے کہ اس ضمن میں ان کے خلاف عوام میں یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ شیخ مبارک رافضی ہے۔ بے دین اور ملحد ہے لہذا اسے قتل کیا جائے۔ یہ ۹۷۷ ہجری کا واقعہ اور اکبر کی سلطنت کا چودھواں سال تھا۔ متعصب اور فتنہ پرور قسم کے مولویوں نے شیخ مبارک کے خلاف اکبر کے خوب کان بھرے اور اسے اس قدر بھڑکایا کہ

لامحالہ اکبر کو مبارک کی گرفتاری اور دربار شاہی میں حاضری کا حکم نامہ جاری کرنا پڑا۔ ادھر فیضی کو جب سازشی ٹولہ کی ریشہ دوانیوں کی خبر ہوئی فوراً اس نے اپنے والد کو آگاہ کیا اور راتوں رات کسی پناہ گاہ کی طرف کوچ کر جانے کا مشورہ ہوا۔ چنانچہ شیخ مبارک مع اپنے بیٹوں، بادشاہ اور ارکان دولت کی نظروں سے بچتے بچاتے ادھر اُدھر عرصہ دراز تک حیران و پریشان سرگرداں رہے۔ انہیں کہیں جائے امان نہ ملی آخر کار جب وہ سب طرف سے پھر پھرا کر آگرہ پہنچے تو یہاں ایک نیک طینت دوست کے گھر قیام کیا۔ یہاں کچھ عرصہ تک قیام کرنے کے بعد جب لوگوں پر ان کے صحیح عقائد و خیالات منکشف ہوئے تو کچھ لوگ ان کے طرفدار ہو گئے۔ اب کیا تھا بادشاہ تک ان کے عقائد صحیحہ کی خبر گئی۔ کچھ مقربان دربار کی بدولت بادشاہ تک ان کی سفارش کی گئی اور وہ مع اپنے بیٹوں عزت واحترام کے ساتھ دربار شاہی میں شرف حضوری سے نوازے گئے۔ یہی وہ واقعہ ہے جو دراصل دربار اکبری میں فیضی کی رسائی کا سبب بنا۔ یہ اکبر کی حکومت کا سترہواں سال تھا۔ فیضی کو اس کے علمی اور شاعرانہ کمالات کی بدولت دربار میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور فیضی بیحد وحساب شاہانہ نوازش واکرام سے بہرہ یاب ہوا۔ فیضی جس شان سے دربار اکبری میں پہنچا اور جو قدر و منزلت اس کی نگاہوں نے دیکھی ان تمام واقعات کی تصویر اس نے ایک قصیدہ میں بڑے عمدہ اور موثر طریقے سے کھینچی ہے جس کے صرف دو شعر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

فیضی سخن طراز ہے ع

سحر نوید رساں قاصد سلیمانی
رسید ہمچو سعادت گشادہ پیشانی
مبشر ان سعادت نداکناں کہ بخواں
نجات نامہ خود ای حزین زندانی

دربار شاہی میں فیضیؔ کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا لیکن اس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہ کی۔ اس کی خوددار طبیعت نے کبھی درباری خدمت گار بننا گوارا نہ کیا۔ طبابت، تصنیف شعر و شاعری ہی کو وسیلہ معاش کے طور پر اختیار کیا۔ شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا۔ یہ فیضیؔ ہی کی صحبت اور علمی تربیت کا اثر تھا کہ شہزادہ دانیال ہندی (برج

بھاکا) کی شاعری سے واقف ہو گیا۔ ۹۹۶ ہجری میں جو اکبر کے تحت نشینی کا ۳۳ واں سال تھا۔ فیضی کو "ملک الشعراء" کا خطاب عطا کیا گیا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ یہ شاعرانہ اعزاز بخشے جانے سے دو تین روز قبل فیضی نے ذیل کا ایک قصیدہ تحریر کیا تھا۔ ع

آن روز کہ فیض عام کردند ۔۔۔ مارا ملک الکلام کردند

از بہر صعود فکرت من ۔۔۔ آرائش ہفت بام کردند

مارا بہ تمام در ربودند ۔۔۔ تا کار سخن تمام کردند

اس قصیدہ میں فیضی اپنے ساتھ بادشاہ کے نیک سلوک اور فیاضی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی نیک بختی اور بلند مرتبہ کا بھی تذکرہ کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس گردش ایام کا بھی حوالہ دیتا ہے جس نے اسے مدتوں در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا اور بالآخر تخت شاہی کا ہم نشیں بنادیا۔

ملک الشعراء کا خطاب پانے کے بعد اب فیضی میں وہ پہلی سی خودداری باقی نہ تھی۔ وہ اب بادشاہ کا اور بادشاہ اس کا ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بادشاہ کے ہر حکم کا تابع اور اس کی مرضی وخواہش کا آئینہ دار تھا۔ اسے مختلف مہمات پر بھیجا جانے لگا اور اکثر وبیشتر بادشاہ کے رفیق سفر رہا۔ ۹۹۳ ہجری میں جب اکبر نے پٹھانوں کی سرکوبی کے لئے فوجیں روانہ کیں تو فیضی کو بھی اس مہم پر روانہ کیا گیا۔ اسی طرح ۹۹۷ ہجری میں کشمیر کے سفر پر بھی اکبر کے ہمراہ تھا۔ بادشاہ کی خواہش پر فیضی کو امور سفارت بھی انجام دینے پڑے۔ نیز رفاہ عامہ اور دیگر انتظامی امور کی نگرانی بھی اسے کرنی پڑی۔ وہ گرچہ شاعر اور حکیم تھا اور ملکی معاملات میں اسے کوئی تجربہ بھی نہ تھا پھر بھی جو خدمت بادشاہ اسے سپرد کرتا وہ نہ صرف یہ کہ اسے قبول کرلیتا بلکہ ایک ذمہ دار کی حیثیت سے اپنا فرض بھی بحسن وخوبی انجام دیتا تھا۔ ایک برس آٹھ مہینہ چودہ دن اطراف میں رہ کر اور مختلف مقامات پر سفارتی امور انجام دیکر ۱۰۰۱ ہجری میں وہ راجدھانی آیا۔ ۱۰۰۳ ہجری میں اکبر نے فیضی سے نظامی کے خمسہ کا جواب لکھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ فیضی نے چار مہینے میں چار ہزار اشعار پر مشتمل اپنی مقبول ومعروف مثنوی نلدمن لکھ کر اکبر کی خواہش کی تکمیل کی۔ نلدمن سے متعلق فیضی کہتا ہے۔ ع

این چار ہزار گوہر ناب ۔۔۔ کانگیختہ ام بہ آتشیں آب

یعنی چار ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی لکھنا میرے لئے پانی میں آگ لگانے کے مترادف ایک سخت جان کام تھا۔

بدایونی اس مثنوی کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں۔

"والحق مثنوی ست کہ دریں صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو و شاید در ہند کسی دیگر گفتہ باشد۔"

بدایونی کہنا چاہتے ہیں کہ امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں سو سال کے عرصے میں شاید ایسی مثنوی لکھنے والا کوئی پیدا ہوا ہو۔ دیکھا جائے تو ملا عبد القادر بدایونی اور شبلی نعمانی اپنے اپنے دور کے مستند مورخ تسلیم کیئے جاتے ہیں لہذا فیضی کی شاعری سے متعلق ان دونوں بزرگوں نے جو رائے قائم کی ہے وہ حق بجانب ہے۔

فیضی دربار شاہی سے منسلک رہ کر مختلف سرکاری امور کی انجام دہی کے علاوہ علمی وادبی خدمات بھی انجام دیتا رہا۔ وہ دربار اکبری کی علمی انجمن کا ایسا آفتاب اور ماہتاب تھا جس کی کرنوں سے عہد اکبری کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا۔ اس کا اصلی مذاق علم و فن کی خدمت تھی۔ وہ کتابوں کا اس قدر دلدادہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ اس کی نجی لائبریری میں طب و نجوم، موسیقی و حکمت، تصوف، ہیئت و ہندسہ، تفسیر و حدیث اور فقہ وغیرہ مختلف علوم و فنون پر مشتمل چار ہزار سے زائد کتابیں تھیں جن میں سے اکثر اس کے اپنے قلمی نسخے تھے۔ اس کی علمی وادبی تصانیف میں ایک سو سے زائد کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں مشہور ترین خمسہ ہے جو نظامی کی پانچوں مثنویوں کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ یہ خمسہ پانچ کتب مثنوی پر مشتمل ہے جن میں مرکز ادوار اور نلدمن مکمل اور دستیاب ہیں۔ بقیہ سلیمان و بلقیس، ہفت کشور اور اکبر نامہ نایاب ہیں۔ موارد الکلم کے عنوان سے تفسیر قرآن بھی فیضی کی شاہکار تصنیف ہے جو بلاد عرب میں کافی مقبول و معروف ہوئی۔ ایک دوسری تفسیر قرآن سواطع الالہام (تفسیر غیر منقوط) کے نام سے فیضی نے لکھی جس پر اسے بڑا فخر تھا اس تفسیر کے متعلق وہ رقمطراز ہے۔

"در عاشر ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ اثنین والف کہ سال حال است تمام شد۔ ایں عطیہ غیبی مخصوص فقیر بود، غرا تبش زیادہ ازاں ست کہ حیرت افزائے این فن نہ گردد۔"

ان قرآنی خدمات کے علاوہ بھگوت گیتا اور فن ریاضی سے متعلق لیلاوتی کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ بھی اس نے کیا۔ جو "بدائع الفنون" کے نام سے موسوم ہے۔ فیضی نے جو بہت بڑا انشا پرداز بھی تھا اپنی انشا پردازی کے جوہر کو بے شمار خطوط اور واقعات کے نمونے میں آشکارا کر دیا ہے۔ ان خطوط میں اس نے اپنے خطیبانہ شان سے بادشاہ، امراء، شیوخ، علماء صوفیاء، ہم عصر اطباء، والدین، برادران اور اعزہ و اقارب کو مخاطب کیا ہے۔ ان خطوط سے عہد اکبری کے تمدن، تہذیب، معاشرت، آداب و رسوم اور ہر قسم کے احوال وکوائف بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے مہابھارت کا بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ ۹ ہزار اشعار پر مشتمل فیضی کا دیوان غزلیات بھی ہے جو "طباشیر الصبح" سے موسوم ہے۔ حمد و نعت، مدح، فخر، تصوف اور اخلاق وغیرہ مضامین پر قصائد کا مختصر مجموعہ بھی ہے۔ اس نے تاریخی مثنویاں بھی لکھنے کی کوشش کی اور "مثنوی فتح گجرات" میں اکبر کی گجرات مہم سے متعلق مختصر کارناموں کا تذکرہ کیا۔ وہ فطرتاً شاعر تھا اور طفلگی ہی سے شعر کہتا تھا۔ اس نے قصیدہ، مثنوی، غزل ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی لیکن مثنوی اور غزل میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس کی زبان بہت سادہ مگر خیالات میں بڑی بلندی اور معنی آفرینی تھی۔ جوش بیان، استعارات و تشبیہات کی ندرت اور فلسفیانہ افکار کا زور اس کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ ان تمام اوصاف و خصوصیات سے متصف ذیل میں اس کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیں۔ ع

ایام بہار آمد و صہبا مزہ دارد
صہبا ز کف ساقی زیبا مزہ دارد
در مذہب ارباب خرد بادہ پرستی
ہر چند حرام آمدہ امّا مزہ دارد
نزدیک تو از بیم کسان گر نتوان رفت
از دور بروی تو تماشا مزہ دارد
پیش من سودا زدہ از شہر مگوئید
مجنون رہ عشقم و صحرا مزہ دارد

از سرو چه خیز د ز صنوبر چه کشاید
نظارهٔ آن قامت بالا مزه دارد

دربار اکبری کا یہ ملک الشعراء جیسے بجا طور پر یہ خطاب حاصل تھا اسے اکبر کی دور اندیشی اور حقیقی انصاف کے تقاضے سے عبارت کرنا زیادہ موزوں ہوگا کیونکہ اس دور میں فیضی کے علاوہ نہ تو کوئی اس لائق تھا جسے یہ اعزاز دیا جاتا اور نہ بادشاہ کی نگاہ فراست ہی نے فیضی کے سوا کسی اور کو لائق اعتنا سمجھا۔ بالآخر یہ فخر زماں دمہ کے عارضہ میں مبتلا ہو کر ۵۰ سالہ زندگی کا سفر طے کرنے کے بعد ۱۰۰۴ھ میں فوت کر گیا۔

کتابیات

۱۔ ملا عبد القادر بدایونی: منتخب التواریخ
۲۔ علامہ شبلی نعمانی: شعر العجم
۳۔ رضازادہ شفق: تاریخ ادبیات ایران
INDO-IRANICA, VOL 38 NOS 3،4, 1985۔۴
IRAN SOCIETY CAL CUTTA

☆☆☆

جامعہ عربیہ نور الاسلام شاہ پیر گیٹ میرٹھ میں تعزیتی جلسہ

حکیم محمد اسلام صاحب کی اہلیہ کا انتقال مورخہ ۸؍ مارچ ۲۰۰۰ء کو ہوا اس تعزیتی جلسے میں مولانا محمد سالم صاحب ودیگر حضرات نے تقریر کی۔ جس میں شہر کی مشہور ومعروف حضرات نے شرکت کی۔

جامعہ عربیہ نور الاسلام شاہ پیر گیٹ میرٹھ ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت حکیم محمد اسلام ہوا۔

مورخہ ۲۷؍ فروری ۲۰۰۰ء بروز اتوار حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوریؒ کی وفات پر تعزیتی جلسہ کیا گیا جس میں شہر کی مشہور ومعروف شخصیات نے شرکت فرمائی۔

پروفیسر عنوان چشتی اور ان کی ادبی خدمات

آزاد اور سیکولر ہندوستان میں اُردو زبان کے ساتھ جس طرح ناروا سلوک کیا گیا اور ہر سیاسی جماعت (چاہے وہ کانگریس ہو یا جن سنگھ، ہندو مہا سبھا یا کوئی دیگر فرقہ پرست پارٹی) سے وابستہ چھوٹے بڑے لیڈر نے غریب اُردو زبان پر جس طرح حملے کئے اور اسے تقسیم ملک کا ذمہ دار گردانتے ہوئے بعض فرقہ پرست عناصر نے تو اسے غیر ملکی زبان تک کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کی، اس کے پیش نظر اُردو زبان کے دفاع، اس کے لیے جدو جہد اُردو کو اس کا جائز حق دلانے کے ارادے سے لنگر لنگوٹ کس کر میدان عمل میں مستعد عمل ہو جانا ایک بہت بڑے مجاہدہ سے کم نہیں ہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے لیے اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے آزاد ہندوستان میں بڑا موقع تھا مگر وہ اُردو کو اس کے خستہ حال پر چھوڑ کر پاکستان جا بسے ایسے میں بیگم حمیدہ سلطانہ، مالک رام، سردار دیوان سنگھ مفتون، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، پنڈت تلوک چند محروم، حیات اللہ انصاری، جوش ملسیانی وغیرہ نے اُردو کے لیے ہر راہ پر کانٹے بکھرے ہونے کے باوجود ہر نامساعد حالات میں بھی اُردو زبان کی مشعل کو مضبوطی سے تھامے رکھا اُردو کے لیے ہواؤں کے رخ کو بدلتے ہوئے اردو کی شمع کو روشن رکھا۔ ان ہی کی مساعی جمیلہ نے اُردو زبان کے لیے ناموافق حالات کو ایک حد تک موافق فضا اور سازگار حالات میں تبدیل کیا۔ آج اُردو کی ترقی واشاعت کے لیے ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی سرکاروں کے تعاون سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اُردو اکیڈمیاں اپنا کام کر رہی ہیں۔ ہندوستان کی راجدھانی اور بہار میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ جن ادیبوں، صحافیوں، قلمکاروں اور قائدین نے اُردو زبان کے لیے آزاد ہندوستان میں جس طرح کام کیا ہے اسے بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی کا نام اُردو دنیا اور ادبی حلقوں میں خوب معلوم و معروف ہے کیونکہ انہوں نے جب اپنے شعور کی آنکھیں کھولی ہیں تو اس وقت اُردو کسمپرسی کے عالم میں تھی۔ اُردو زبان کا مستقبل نا معلوم تھا۔ ایسے میں اُردو زبان سے اپنے کو وہ ہی وابستہ کرنا چاہیے گا جس کے دل میں اُردو کے لیے کچھ کر گذرنے کی تڑپ ہوگی، جو اُردو کا مخلص ہوگا اُردو کا شیدائی ہوگا، اُردو کا دیوانہ وار عاشق ہوگا۔ چنانچہ پروفیسر عنوان چشتی نے اُردو زبان ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، علمی صلاحیتیں اور تعلیمی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ہر مستعبد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اُردو زبان و اُردو ادب کی وہ عظیم الشان خدمات انجام دے ڈالی ہیں جنہیں اُردو زبان وادب کی تاریخ میں جلی عنوان کے ساتھ جگہ ملے گی۔ ایسا ہمارا یقین ہے کیونکہ پروفیسر عنوان چشتی کی علمی وادبی کاوشوں سے لاتعداد تشنگان علم وادب سیراب ہو چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن طوالت سے بچتے ہوئے ہم یہاں ان کی کچھ چنیدہ ادبی تصانیف اور ان کی شخصیت اور کتابوں پر اُردو کے جانے مانے ادیبوں کی نگارشات پر یہاں روشنی ڈالتے ہیں۔

☆(۱) نام کتاب: اصلاح نامہ

مصنف: جناب پروفیسر عنوان چشتی

قیمت: عام ایڈیشن ایک سو روپے ڈی لکس ایڈیشن ایک سو پچاس روپے

پروفیسر عنوان چشتی کی یہ کتاب خانقاہ پبلی کیشنز، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع ہوئی ہے۔ کتابِ مذکورہ بنیادی طور پر اصلاح سخن کے فن پر ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت کے بارے میں خود پروفیسر عنوان چشتی کے الفاظ میں: ''اس کتاب میں میرے بعض شاگردوں کا تذکرہ ان کے کلام پر میری اصلاحیں اور ان کی توجیہیں ضرور شامل ہیں۔ مگر بنیادی طور پر کتاب اصلاح سخن کے فن پر ہے ممکن ہے بعض ''حاسدان روسیاہ'' شاگردوں کا تذکرہ دیکھ کر مجھ پر خودستائی کا الزام لگائیں یا ذاتیات پر حملہ کرنے پر اُتر آئیں ایسے کور باطنوں کو اپنا دور ہی سے سلام۔''

(ب)اصلاح نامہ (جلد اول) کا ضمیمہ شامل کیا گیا ہے جو چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت ۳۵ روپے ہے۔کتاب اصلاح نامہ کے ساتھ اصلاح نامہ (ضمیمہ) بھی دیکھنے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔اُردو ادب میں پروفیسر عنوان چشتی کی یہ کتاب اصلاح نامہ معہ ضمیمہ اصلاح نامہ ایک اچھی اور قابل مطالعہ کتاب ہے اور اس میدان میں وہ اپنے پیش روؤں سے بازی مارلے گئے ہیں۔

☆(۲) کتاب کا نام: چاند چکور اور چاندنی

از: جناب پروفیسر عنوان چشتی

قیمت: پچاس روپے

پروفیسر عنوان چشتی کی مذہبی شاعری پر یہ کتاب مرتب ہے اور بقول خود ان کے مذہبی شاعری کو نظم کے دائرے ہی میں رکھا ہے مگر اس شاعری کی ہیئتیں جدا جدا ہیں۔ان پر نظم کے بدلتے ہوئے تصورات کا اثر ہے۔کتاب کے آخری صفحات میں پروفیسر عنوان چشتی کا سوانحی خاکہ ہے جس میں ان کی پیدائش،نام والدین، تعلیم،شادی،اولاد اور اس کے بعد ملازمت کی منزلیں،اندرون و بیرون ملک کے سفر کی روداد،ادبی خدمات،اُردو صحافت سے وابستگی اور عوامی خدمات کا دائرہ انعامات کی تفصیلات کا اندراج ہے۔جس کے مطالعہ سے آپ بیتی پڑھنے کا مزہ آتا ہے اور آپ بیتی کا موضوع سب سے زیادہ دلچسپ موضوع ہے۔اس لیے قدرتی طور پر اس کتاب کی دلچسپی دوبالا ہوگئی ہے۔

☆(۳) نام کتاب: حضرت علی کرم اللہ وجہہ

از: جناب پروفیسر عنوان چشتی قیمت: پچاس روپے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عقیدت کے غلو میں بعض روایات ایسی بھی درج ہوگئی ہیں جو اہل سنت والجماعت کے نقطہ نظر سے ضعیف اور ناقابل یقین ہیں۔ مثلاً حدیثِ مدینہ، حدیثِ نور، حدیثِ منزلت، حدیثِ خیر، حدیثِ خندق، حدیثِ طیر اور حدیثِ ثقلین کا اہل تشیع کے یہاں جو بھی درجہ و مرتبہ ہو بہر حال اہل سنت والجماعت کے یہاں اس کی نہ کوئی

اہمیت ہی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ذکر، مگر فاضل مصنف نے مذکورہ بالا احادیث کی کتابوں کے ناموں کے اندراج کے بعد حضور اکرم ﷺ سے یہ ارشاد منسوب کر دیا ہے۔ نمبر ۱: ''میں جس کا مولا ہوں علی بھی اس کے مولا ہیں۔'' نمبر ۲: ''میں علم کا مدینہ ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔''

ان احادیث کے ثقہ و مستند ہونے میں شاید فاضل مصنف کو بھی اشتباہ ہے اسی لیے انہوں نے اس بات میں پناہ لی ہے۔ اظہارِ خیال میں عقیدت کا رنگ شامل ہے اور ایسا ہونا ناگزیر نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اسی لیے ہم اس کتاب کو فاضل مصنف کی جوش عقیدت کا مظہر سمجھتے ہیں۔ اگر قارئین بھی اسی نقطہ نظر سے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ انسان عقیدت میں اندھا ہو کر کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے۔ کتاب مذکورہ کو دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی سے متعلق تصانیف

☆(۱) اخباروں کے بیچ

از: محترمہ سیدہ عنوان چشتی قیمت: چالیس روپے

جناب پروفیسر عنوان چشتی کے بارے میں اخبارات نے وقتاً فوقتاً جو اظہار خیال کیا ہے وہ سب جمع کر کے محترمہ عنوان چشتی نے پروفیسر چشتی کے اس شعر کے ساتھ

کوئی سایہ ہے نہ ہم سایہ مگر
زندگی ملتی ہے اخباروں کے بیچ

مندرجہ بالا عنوان کے تحت ایک کتاب مرتب کی ہے۔ دلچسپی کے ساتھ جو قابل مطالعہ ہے۔

☆(۲) مقابل ہے آئینہ (پروفیسر عنوان چشتی کے ادبی انٹرویوز کا مجموعہ)

مرتبہ جناب فیصل انتخاب چشتی قیمت مجلد 150 روپے

اس کتاب کے پیش لفظ میں فاضل مرتب نے ایک سچی بات کے تحت لکھا ہے کہ پروفیسر عنوان چشتی کے فکر و فن پر متعدد یونیورسٹیوں نے پی، ایچ، ڈی اور ایم فل کے مقابلے

لکھوائے ہیں اور ریسرچ اسکالروں کو ان کے فکر و فن کو کام کرنے کے سلسلے میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کی ڈگری منظور کی ہیں۔ میں نے ان کے بکھرے ہوئے انٹرویوز کو جمع کیا اور انہیں ایک لڑی میں پرو کر پیش کر رہا ہوں۔ یہ کتاب پروفیسر عنوان چشتی کے ذہن اور ضمیر کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے۔" کتاب کے ہر صفحہ پر ادبی رنگ کی چھاپ ہے جو کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتی ہے۔

☆(۳) پیمانۂ صفات

از: شہپر رسول، صفحات: ۴۸۰، قیمت: دو سو روپے

جناب پروفیسر عنوان چشتی کی شخصیت ان کے فن وادب تخلیقات پر نامور و قابل مصنفین اور نمایاں ہستیوں کے مضامین و مقالات تبصرے و تاثرات اور دیگر تحریروں کا پیش قیمت مرقع و مجموعہ اعلیٰ درجہ کا ادبی مواد جو قارئین کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ زبان سلیس اور بامحاورہ ہے۔ بعض مقامات و مضامین تو ادبی چاشنی سے اس قدر بھرپور ہیں کہ جس کے ذائقہ کو بار بار چکھا جائے تو طبیعت کو سیرابی نہ ملے۔

☆(۴) نام کتاب: عنوان چشتی: شخص اور شعور

از: جناب سید عبدالشکور قیمت سو روپے

فقیر عشق سے ملیو ضرور دلی میں
وہ ایک شخص نہیں، مستقل ادارہ ہے

یہ شعر کتاب مذکورہ کی مکمل ترجمانی کر رہا ہے۔ فاضل مصنف حرف آغاز میں رقم طراز ہیں۔ میں ایک مدت سے جناب پروفیسر عنوان چشتی کا کلام اور مضامین شوق و ذوق سے پڑھتا تھا جن کے مطالعہ کے دوران میں مجھے خیال آیا کہ میں کیوں نہ ان ہی کی شخصیت اور ادبی خدمات کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بناؤں چنانچہ میں نے اپنے اساتذہ کے سامنے اس خیال کو پیش کیا خدا کے فضل سے میرے اساتذہ نے اس خیال کو پسند کیا اور مجھے عثمانیہ یونیورسٹی میں اس موضوع پر ایم فل کا مقالہ لکھنے کی اجازت مل گئی۔ پروفیسر عنوان چشتی بیک

وقت نقاد، محقق، شاعر اور خاکہ نگار ہیں ان کی ادبی شخصیت کا ارتقاء خط مستقیم میں نہیں بلکہ مختلف سمتوں میں ہوا ہے۔ جس کا ثبوت ان کی تحریر و تقریر اور نظم و نثر فراہم کرتی ہے انہوں نے اپنے مقطعوں میں اپنی پہلودار اور پیچیدہ شخصیت کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔

کبھی ہے شاعر ،صوفی، کبھی ادیب وخطیب
تمہیں بتاؤ کہ عنوان ہے قلندر کیا
فقیر عشق سے ملیو ضرور دلی میں
وہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ ہے

میں نے ان کی حیات سیرت اور ادبی کارناموں کا جو مرقع پیش کیا ہے اس میں ان باتوں کے علاوہ موصوف کی ریاضت اور مطالعہ کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

کتاب میں پروفیسر عنوان چشتی کی کم سنی اور جوانی کے فوٹو کے ساتھ ان کی اہلیہ بچوں کے ساتھ ساتھ ملک کے نامور عوامی وسیاسی شخصیتوں کے ساتھ پروفیسر عنوان چشتی کے فوٹوؤں کی اشاعت نے کتاب کو رنگارنگ بنادیا ہے اور آج کے ماڈرن دور میں فوٹو کی اشاعت سے کسی طرح بچاہی نہیں جاسکتا ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی کی تصانیف اور ان کی ادبی و شخصبت، سیرت وفن پر اردو کے بلندپایہ مبصرین ومدبرین کی تصانیف جو ہر لحاظ سے اردو قارئین کے لئے قابل مطالعہ ہیں۔

ملنے کا پتہ :

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ یا پھر عنوان چشتی کے رہائشی پتے سے بھی کتابیں منگوائی جاسکتی ہیں۔ ان کا رہائشی پتہ ہے:

پروفیسر عنوان چشتی
E-126 سیکٹر، 41 نوئیڈا، ضلع غازی آباد (یوپی)

☆☆☆

بیانِ ملکیت و تفصیلات

متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ ۸

مقام اشاعت	:	۴۱۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
وقفہ اشاعت	:	ماہانہ
طابع کا نام	:	عمید الرحمٰن عثمانی
قومیت	:	ہندوستانی
ناشر کا نام	:	عمید الرحمٰن عثمانی
سکونت	:	۴۱۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
ایڈیٹر کا نام	:	عمید الرحمٰن عثمانی
قومیت	:	ہندوستانی
سکونت	:	۱۴۱۵، اردو بازار دہلی ۶
ملکیت	:	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ۶

میں عمید الرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں

(دستخط طابع و ناشر)

عمید الرحمٰن عثمانی

R.N.I.REGN. NO. 965/57 Price Single Copy :Rs.6/= Mar. Apr. 2000

BURHAN (Monthly)

Edited by: Amidur Rehman Usmani

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid Delhi-110006. Phone 3262815-3241136

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ہماری مطبوعات

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
ابوبکر صدیق کے سرکاری خطوط	۱۲۵	تاریخ ملت جلد ششم خلافت عباسیہ دوم	۹۰
العلم والعلماء	۱۲۵	تاریخ ملت جلد ہفتم تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ	۶۰
اسلام میں غلامی کی حقیقت	۱۲۵	تاریخ ملت جلد ہشتم خلافت عثمانیہ	۶۰
اخلاق اور فلسفہ اخلاق	۱۲۵	تاریخ ملت جلد نہم تاریخ صقلیہ	۵۵
اسلام کا نظام عفت و عصمت	۷۵	تاریخ ملت جلد دہم سلاطین ہند حصہ اول	۶۵
آثار و اخبار جلد اول	۱۰۰	تاریخ ملت جلد یازدہم سلاطین ہند حصہ دوم	۴۵
الانوار	۱۰۰	ترجمان السنہ کامل (چار جلدیں)	۱۲۰۰
امام غزالی کا فلسفہ مذہب اخلاق	۱۰۰	ترجمان السنہ جلد اول	۳۰۰
انتخاب الترغیب والترہیب (کامل)	۶۰۰	ترجمان السنہ جلد دوم	۳۰۰
انتخاب الترغیب والترہیب جلد اول	۱۵۰	ترجمان السنہ جلد سوم	۳۰۰
انتخاب الترغیب والترہیب جلد دوم	۱۵۰	ترجمان السنہ جلد چہارم	۳۰۰
انتخاب الترغیب والترہیب جلد سوم	۱۵۰	حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ	۱۲۵
انتخاب الترغیب والترہیب جلد چہارم	۱۵۰	حضرت عثمان کے سرکاری خطوط	۱۲۵
الفوز الکبیر اردو	۷۵	حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۱۵۰
ایشیا میں آخری نو آبادیات	۵۰	حیات عبدالحی	۱۵۰
تاریخی مقالات	۱۲۵	حجاز و ماورائے حجاز جلد اول	۰
تاریخ مشائخ چشت	۲۵۰	حجاز و ماورائے حجاز جلد دوم	۵۰
تاریخ گجرات	۱۷۵	حضرت عثمان ذوالنورین	۱۵۰
تاریخ ادبیات ایران	۲۵۰	حیات ذاکر حسین	۲۰
تاریخ ہند پر نئی روشنی	۷۵	خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام	۵۰
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	۱۲۵	خلافت راشدہ کا اقتصادی جائزہ	۵۰
تاریخ ملت کامل بارہ جلدیں	۷۲۰	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد اول	۱۵۰
تاریخ ملت جلد اول نبی عربی	۹۰	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد دوم	۱۵۰
تاریخ ملت جلد دوم خلافت راشدہ	۹۰	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد سوم	۱۵۰
تاریخ ملت جلد سوم خلافت بنی امیہ	۹۰	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد چہارم	۱۵۰
تاریخ ملت جلد چہارم خلافت ہسپانیہ	۵۰	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد پنجم	۵۰
تاریخ ملت جلد پنجم خلافت عباسیہ اول	۷۵	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد ششم	۱۵۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد: ۱۲۶
شمارہ: ۵، ۶
مئی، جون

بُرہان

اس شمارے میں

زرِ تعاون
فی پرچہ: ۱۰ روپے
سالانہ: ۱۲۰ روپے
رحمٰن کمپیوٹرس دہلی
Ph: 6952082

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
منیجر ماہنامہ برہان
4138-اردو بازار، جامع مسجد دہلی 110006
فون نمبر: 3262815-3241136

عمیدالرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

گذشتہ دنوں دہلی پولیس نے کرکٹ میچ میں سٹہ بازی کا ایک ایسا بڑا اسکینڈل پکڑا ہے جس سے کرکٹ کھیل کی دنیا میں ایک زلزلہ آگیا ہے۔ کہاں تو یہ کھیل تفریح طبع کے لیے تھا اور کہاں اب یہ کھیل ایک چھلانگ میں غربت سے امیری کی بلندیوں کو چھو لینے والا بن گیا ہے۔ اس اسکینڈل کے بے نقاب ہونے سے ماڈرن زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں بدعنوانیوں کی مضبوط جڑوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ سرکاری وغیر سرکاری دفاتر میں میں بدعنوانیاں اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ ہر آدمی اس سے پریشان ہے اور وہ اس سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈ رہا تھا کہ کھیلوں میں بھی اس قدر بھرشٹاچار ہو جانے کی خبر نے تو ایک طرح سے اس بیماری سے چھٹکارا مل جانے سے مایوس ہی کر دیا ہے۔ کسی زمانے میں بڑے بوڑھے بچوں کو نصیحت کرتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ "پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے نواب، کھیلو گے کودو گے تو ہو گے خراب" آج اس کہاوت کا مطلب ہی بدل گیا ہے۔ آج تو کھیل لاکھوں کروڑوں روپے کمانے کا ذریعہ ہے۔ پڑھ لکھنے کے بعد اگر کوئی بڑا عہدہ پا لینے میں کامیاب ہو گیا تو اسے آج کے مہنگائی کے تمام بھتوں کے ساتھ پینتس چالیس ہزار روپے ماہانہ ملیں گے لیکن کوئی سیاست کی دہلیز پر قدم رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو راتوں رات (لکھ پتی کیا اب تو کروڑ پتی کہنا ہی زیادہ درست ہوگا) کروڑ پتی بلکہ اب ارب پتی بن جاتا ہے۔ اور جو کھیل گئے گذرے زمانے کے بڑے بوڑھوں کے لیے بچوں کے مستقبل کو غارت کرنے کا باعث تھا وہ آج کے والدین کے لیے ہونہار بچوں کے روشن مستقبل کی علامت بن گیا ہے۔ ایک مشہور کرکٹ کھلاڑی جو ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ہندوستانی ٹیم کے کپتان تھے وہ بچپن میں اس قدر غریب تھے کہ گلی کوچوں میں ہاتھ سے بنی ٹوٹی پھوٹی گیندوں سے کھیلا کرتے تھے اور ان کے پاس گیند وبلا خریدنے تک کے لیے پیسے نہ تھے۔ لیکن جب وہ کسی طرح اس کھیل میں مہارت حاصل کر کے ہندوستانی کرکٹ ٹیم میں شامل ہوئے اور انہوں نے لگاتار تین

سنچریاں بناڈالیں توان کے وطن کے لوگوں نے خوشی ومسرت سے جھومتے ہوئے ان کے لیے آپس میں کچھ رقم (چندہ) اکٹھا کرکے انہیں ایک کار خرید کر تحفہ میں دی۔ اس بات کو مشکل سے ۱۵،۱۶ رسال ہی ہوئے ہوں گے کہ ابھی اخبارات میں ان کی دولت کے جو اعداد وشمار شائع ہوئے ہیں اسے پڑھ کر ہم دنگ ہی رہ گئے۔ اگر اس خبر کو ہم نے صحیح پڑھا ہے توان سے متعلق یہ خبر ہے کہ انہوں نے ۱۶ رکروڑ روپیہ انکم ٹیکس کا ادا کیا ہے۔ اب اندازہ لگائیں کہ ان کے پاس دولت کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ اس قدر دولت ملنے کے بعد بھی اگر کرکٹ کے کھلاڑی اپنے تماشائیوں کے اعتماد ولگاؤ، انسیت اور محبت کے ساتھ غداری کریں تو انہیں آپ کیا کہیں گے۔ ہماری معلومات کے مطابق ایک میچ میں کھلاڑی کو بہت بڑی رقم ملتی ہے اور اس کی ذاتی عمدہ کارکردگی پر خصوصی انعامات سے بھی اسے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ دولت کی اس قدر ریل پیل کے بعد کرکٹ کھلاڑی کی ہوس بھرتی نہیں ہے۔ جنوبی افریقہ کی کرکٹ ٹیم کے کیپٹن نے سٹے بازی کے ذریعہ لاکھوں کروڑوں روپے کمائے جسے دہلی پولیس نے بڑی جانفشانی کے ساتھ پورے ثبوتوں کے ساتھ پکڑا ہے اس کے بعد پاکستان کے اکثر اور ہندوستان کے بعض کھلاڑیوں کے بھی سٹہ بازی میں شامل ہونے کی خبر نے کرکٹ کھیل کی دنیا میں تہلکہ ہی مچا کر رکھ دیا ہے۔ کھلاڑی اپنی پاکدامنی کی صفائی دے رہے ہیں۔ کرکٹ بورڈ کے ذمہ دار کرکٹ سے اس بدعت وبدعنوانی کو مٹاڈالنے کی تدبیر سوچنے میں مستعد عمل ہیں اور قانون کے رکھوالے ایسے ایسے بدکردار کھلاڑیوں پر قانون کا شکنجہ کسنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ ایک دوسرے پر الزامات اور جوابی الزامات کی بوچھاڑ کرنے میں جٹ گئے ہیں۔ لیکن کوئی بھی اصل مرض کو ڈھونڈنے کی زحمت نہیں اٹھانا چاہتا ہے۔ جب ہر شخص کا مطمح نظر پیسہ بٹورنا ہے چاہے وہ کسی بھی ذریعہ سے ہو تو پھر مرض کا علاج کیسے ہوسکتا ہے۔ سیاست میں، انتظامیہ میں، کھیل کود میں ہر طرف پیسہ کمانے کی ہوڑ لگی ہوئی ہے۔ کسی بھی طریقہ سے آدمی اپنے ساتھی پڑوسی یا ہم رتبہ سے آگے نکل جانے کی طمع میں مست ہو تو وہاں جو بھی کچھ ہو جائے کم ہی ہے۔ ایک ہندی روزنامہ میں ایک مضمون کا عنوان تھا: "آؤ شرم ڈھونڈیں" جس کے تحت مضمون نگار کے کہنے کا مقصد تھا کہ جب کسی کے دل ودماغ سے شرم ہی نکل جائے تو اس سے سب کچھ ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہے۔ مذہب ہمیں درس دیتا ہے حیاء ایمان کا جز ہے اور انسانی قدروں سے جب مذہب ہی کو مٹادینے کے حربے

استعمال ہونے لگیں تو اعلیٰ قدروں کی امید کرنا ہی عبث ہے۔ آج الیکٹرک میڈیا کے زور نے مذہب سے انسانوں کو دور سا کر دیا ہے اور پھر رہی سہی کسر ٹی وی پروگراموں، فلمی ناچ گانوں نے پوری کر دی ہے اس کے بعد بھی اگر کوئی انسان اعلیٰ قدروں کی تلاش کرے تو اسے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے کے علاوہ ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ اور اب تو ان ملکوں کے عوام بھی سائنس کی بعض ایجادات سے پریشان ہو چکے ہیں۔ موجودہ دنیا کے سب سے طاقتور اور کمپیوٹر و الیکٹرک میڈیا کی ایجادات کے ہیرو امریکہ کے صدر بل کلنٹن کی زوجہ ہیلری کلنٹن نے اپنے تازہ انٹرویو میں کہا ہے کہ "ٹیلی ویژن بچوں کا دماغ خراب کرتا ہے، گندہ کرتا ہے، امریکی معاشرہ کی گراوٹ کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ ہے۔" جب امریکہ کے عوام اس کو برائی سمجھنے لگے ہیں جب کہ اس سے پہلے انہیں اس میں کوئی بُرائی نظر نہ آتی تھی۔ مشرقی ممالک کے عوام تو شروع ہی سے اسے بُرائی سمجھتے تھے، ان کا اس ٹیلی ویژن کے بد اثرات سے کیا حال ہوگا یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک بُرائی سے ہزاروں بُرائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انسانی معاشرے میں اس وقت جو بھی بُرائیاں جو اب خطرناک موڑ پر پہونچ چکی ہیں اس میں سب سے بڑا دخل ٹیلی ویژن میں ۲۴ گھنٹے دکھائی جانے والے پروگرام ہی سے پھیلے اثرات کا ہی ہے۔ جب تک اس بڑی بُرائی کو ختم کرنے کی تدابیر اختیار نہیں کی جائیں گی اس وقت تک انسانی معاشرے میں پھیلے جرائم قتل، زنا، چوری بھرشتاچار وغیرہ کی خاتمے کی امید کرنا ہی بے کار ہے۔

(چھٹی قسط)

فنِ تاریخ گوئی کی ابتداء

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں ڈبل ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی (لیکچرر انگلش)
انٹر کالج اٹاوہ ضلع کوٹہ (راجستھان)

اختلافات حساب جمل:

فن تاریخ گوئی میں جن حروف کے اعداد متعلق اختلافات نظر آتے ہیں وہ (۱) الف ممدودہ (۲) الف مقصورہ (۳) کھڑا زبر (الف) (۴) ہمزہ (۵) حرف مشدد (۶) تائے مربوط یعنی گول ۃ اور (۷) کاف بیانیہ ہیں۔ لیکن ان میں بھی صرف الف ممدودہ، ہمزہ اور تائے مربوط کے سلسلے میں ہی زیادہ اختلاف ہے کہ ان کے اعداد بہ اعتبار کتابت شمار کئے جائیں یا محض تلفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے عدد اخذ کئے جائیں۔ آئندہ سطور میں اساتذۂ فن کے اختلافات کو سامنے رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں صحیح اصول منتخب کرنے اور کسی حتمی رائے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ کسی مادہ کے سامنے یا نیچے اگر تاریخ گو مطلوبہ سنہ ہندسوں میں درج نہیں کرے تو قاری بھی اس سے درست سنہ بر آمد کر سکے۔

اس سلسلہ میں ابتداءً اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ فن تاریخ گوئی میں ترجیح طرز کتابت کو حاصل ہے یا تلفظ کو۔ اساتذۂ فن کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ اس فن کا مدار کتابت پر ہے نہ کہ تلفظ پر۔ میر عبدالجلیل بلگرامی [۱] (م ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) علامہ غلام علی آزاد بلگرامی [۲] (م ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء) سید محمد علی جویا [۳] (م ۱۲۸۷ھ/۱۸۸۰ء کے بعد) منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی [۴] (م ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء) حکیم ضامن علی جلال لکھنوی [۵] (م ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء) عبدالعزیز دلا مدراسی [۶]

۱، ۲ بحوالہ غرائب الجمل صفحہ ۸۰، ۸۱　۳ خیابان تاریخ (سرو دغیبی) صفحہ ۷　۴ ملہم تاریخ صفحہ ۴　۵ افادۂ تاریخ صفحہ ۴　۶ غرائب الجمل صفحہ ۸۰

(م ۱۳۴۳ھ ۲۴-۱۹۲۳ء) میر مہدی حسین[۱] رضوی الم (ولادت ۱۲۸۳ھ) حکیم میر نادر علی رعد حیدر آبادی[۲] (م ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء) سید مسعود حسن مسعود[۳] (ولادت ۱۳۹۲ھ ۱۸۸۵ء) طامس ولیم بیل[۴] مشفق رضوی عماد پوری[۵] نیز ڈاکٹر قیام الدین[۶] اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری[۷] وغیرہ کا متفقہ خیال ہے کہ حساب جمل کا تمام تر دار و مدار مکتوبی حروف پر مبنی ہے نہ ملفوظی حروف پر علامہ نجم الغنی نجمی نے اس سلسلہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے بڑی صائب رائے دی ہے۔

"حروف مکتوبی کی قید اس لئے ہے کہ جو حروف لکھنے میں نہیں آتے ان کے عدد محسوب نہیں ہوتے اور جو لکھے جاتے ہیں اگر چہ پڑھے نہ جاویں، عدد ان کے لئے جاتے ہیں۔"[۸]

اکابرین اساتذۂ فن کی اس متفق علیہ رائے کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ تاریخ گوئی علم عروض کے برخلاف تلفظ کو نہیں بلکہ کتابت کو اعتبار حاصل ہے۔ اس بات کو فن تاریخ گوئی میں بنیادی اصول تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس بنیادی قاعدہ کی خلاف ورزی بھی عام رہی ہے۔ اس کا اندازہ مذکورہ بالا متنازعہ فیہ حروف کے بارے میں ذیل کی تصریحات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] گلبن تاریخ صفحہ ۵ [۲] مرأت الخیال (گنجینۂ تاریخ) [۳] عندلیب تواریخ صفحہ ۳۲-۳۳ [۴] مفتاح التواریخ دیباچہ صفحہ ۳ [۵] گنجینہ تاریخ صفحہ ۴-۵ [۶] "CORPUS OF ARABIC & PERSIAN INSCRIPTIONS OF BIHAR". P.373 صفحہ ضمیمہ ۱

[۷] فن تاریخ گوئی صفحہ ۱۲۔ ڈاکٹر قیام صاحب (م ۲۷/ اگست ۱۹۹۸ء) لکھتے ہیں کہ:

IN WORKING OUT THE DATES, THE VALUE OF EACH LETTER WRITTEN, WHETHER PRONOUNCED OR NOT, IS TO BE CALCULATED. FOR EXAMPLE THE SECOND "ا" IN THE WORD "ادخلوا" IS NOT PRONOUNCED BUT ITS VALUE IS TAKEN IN TO ACCOUNT ON THE OTHER HAND, THE LETTERS WHICH MAY BE PRONOUNCED, BUT ARE NOT WRITTEN SUCH AS THE SECOND "ا" IN "اسحٰق" ARE NOT TO BE TAKEN IN TO ACCOUNT IN WORDS SUCH AS "عیسیٰ" OR "مرتضیٰ" WHERE THE LAST LETTER IS "ی"(10) BUT IS PRONOUNCED AS "ا (1) THE NUMBER OF "ی" NOT "1" WILL BE ADDED .P.373 APPENDIX 1-

[۸] بحر الفصاحت صفحہ ۹۱۵ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء۔

الف ممدودہ: اساتذۂ فن کے نزدیک پہلا اختلاف الف ممدودہ کے سلسلہ میں ہے۔ بالعموم اس کا ایک عدد لیا جاتا ہے۔ مگر حسب موقعہ وضرورت اس کے دو عدد بھی شمار کر لئے جاتے ہیں۔ بقول حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (م ۷۵۷ھ) "مد" بے کار بھی ہے اور کار آمد بھی۔ ع

بے کارم و باکارم چوں مد بحساب اندر

(یعنی میں بیکار بھی ہوں اور کار آمد بھی جس طرح حساب کے اندر "مد") جن اساتذہ نے الف ممدودہ کے دو عدد محسوب کرنا درست قرار دیا ہے ان کے نزدیک اس کی وجوہات یہ ہیں کہ:

(۱) عربی میں الف ممدودہ میں دو الف ہیں جیسے اٰمنوا، اٰل وغیرہ (۲) فن عروض میں بھی "آ" بروزن "فا" شمار ہوتا ہے (۳) فارسی لغات کی تمام تصنیفات میں حروف تہجی کے بیان میں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی فصلیں علاحدہ علاحدہ موجود ہیں اور (۴) الف ممدودہ پڑھنے میں دراز ہوتا ہے جیسے آمدن، آموختن، آوردن وغیرہ میں اس بابت سب سے زیادہ اصرار تسلیم سہسوانی کو ہے وہ لکھتے ہیں:

"الف ممدودہ میں دو الف ہیں اور دو ہی عدد لینا چاہیئے۔ مگر سو ہزار جھوٹے گواہوں کے سامنے ایک سچے گواہ کا قول کون باور کر سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ عوام قواعد سے نا آشنا ہیں اور فن تاریخ سے بے بہرہ اس لئے الف ممدودہ اور مقصورہ میں فرق نہیں کر سکتے۔"[۱] اس سے ذرا پہلے وہ (تسلیم) نواب حسین علی خاں اثر کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"جو لوگ ناواقف ہیں الف مقصورہ والف ممدودہ میں فرق نہیں کرتے۔"[۲] شہزادہ اورنگ زیب کے قطعۂ ولادت سے استناد حاصل کرتے ہیں کہ "ابو طالب کلیم ہمدانی نے الف ممدودہ کے دو عدد قرار دیئے ہیں اور یہی طریقہ اچھا ہے۔

چوں بدیں مژدہ آفتاب انداخت　　　افسر خویش بر ہوا چو حباب
طبع دریافت سال تاریخش　　　زدر قم آفتاب عالمتاب

(۱۰۲۸ھ) کذا ۱۰۲۹ھ

اس مادہ میں بقاعدہ مرقومہ بالا ایک عدد زیادہ تھا۔ شاعر نے آفتاب افسر خویش انداخت سے

---

۱ و ۲ ملہم تاریخ صفحہ ۳۷

اشارہ کیا کہ مد الف جو علامت ممدودہ ہے گرادیا پس ایک ہزار ستائیس باقی رہے [۳] (کذا ایک ہزار اٹھائیس باقی رہتے ہیں) صاحب فرہنگ آصفیہ بھی کلیم کے مذکورہ مادہ ولادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مد در حقیقت الف مقصورہ اور ہمزہ سے مرکب ہے۔ پس اس کے دو عدد کیوں نہ مانے جائیں۔ چنانچہ مرزا طالب کلیم نے اسی پر عمل کرکے عالمگیر کے پیدا ہونے کی تاریخ میں "آفتاب" کے الف ممدودہ کو دو الف (شمار) کر تخرجہ کیا ہے۔" [۱]

کلیم کے مادہ کے سلسلہ میں متذکرہ بالا بیانات میں دو سقم ہیں اول یہ کہ ہمزہ حروف ابجد میں شامل نہیں بقول داغ: یہ حرف ہمزہ وہ ہے کہ جس کا عدد نہیں۔ [۲] دوسرے کلیم ہمدانی نے ولادت اورنگ زیب کے مادہ میں لفظ "آفتاب" کے الف ممدودہ کا صرف ایک عدد ہی اخذ کیا ہے۔ "آفتاب عالمتاب" کے اعداد کا میزان ۴۸۴+ ۵۴۴=۱۰۲۸ ہوتا ہے اور مصرع مادہ سے قبل تیسرے مصرع: "افسر خویش بر ہوا چو حباب" میں ایک عدد کا تخرجہ پوشیدہ ہے۔ بایں سبب ۱۰۲۸-۱=۱۰۲۷ھ برآمد ہوتے ہیں جو شہزادہ کا سال ولادت ہجری ہے [۳] دونوں حضرات سے میزان میں سہو ہوا ہے۔ ممدودہ کے دو عدد لینے پر ۱۰۲۹ حاصل ہوں گے اور ایک عدد کا تخرجہ کرنے پر ۱۰۲۸ھ اور شہزادہ کی ولادت کا یہ سنہ تاریخی حقائق سے ثابت نہیں۔ [۴] ملا مرشد یزدی (م ۱۰۲۱ھ) کے مادۂ تاریخ سے بھی ۱۰۲۷ھ کی تائید ہوتی ہے۔

بگرفت جہاں پرتو رخارش تاریخ　　ایں شد کہ "جہانگیر شدہ نسل جہانگیر" [۵]　۱۰۲۷ھ

علامہ آزاد بلگرامی نے کلیم کے مادۂ تاریخ ہی میں ایک عدد کے تخرجے کی صورت بتلائی ہے [۶] تسلیم سہسوانی نے ایک دوسرے مقام پر الف ممدودہ کے دو عدد شمار کرتے ہوئے اس کی صراحت بھی کردی ہے۔

---

[۱] فرہنگ آصفیہ ۱:۸۵ کالم ۲　[۲] نقوش لاہور خطوط نمبر ۲:۳۹۸ طبع اول اپریل، مئی ۱۹۶۸ء مکتوب نوح ناروی۔
[۳] ملاحظہ ہو مآثر جہانگیری از خواجہ کامگار حسینی صفحہ ۵۱۵ مع مقدمہ وحواشی وتعلیقات (؟) از عذرا علوی چاپ ہند ایشیا پبلشنگ ہاؤس ممبئی ۱۹۷۸ء نیز اقبال نامہ جہانگیری از معتمد خاں بخشی صفحہ ۱۲۷ بتصحیح مولانا محمد رفیع فاضل دیوبند۔ پبلشر رام دیال اگروال، آگرہ سنہ طباعت درج نہیں۔
[۴] برائے تفصیل دیکھیے مقالہ "شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا سنہ ولادت اور قطعۂ تاریخ ابو طالب کلیم" از عبد الرؤف خاں مشمولہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ مارچ ۱۹۹۴ء صفحہ ۱۹۹ تا ۲۱۲
[۵] دیکھئے مہر نیمروز خاقانی از نواب سید محمد جعفر علی خاں صفحہ ۲ مطبوعہ ریاض المومنین پریس کاظمین لکھنؤ جنوری ۱۹۲۱ء
[۶] خزانۂ عامرہ صفحہ ۳۹۵-۳۹۶ مطبوعہ ۱۹۰۰ء مطبع نول کشور کانپور

بممدوده تسلیم گفتم بسال کہ "آمد بصورت کده نقشبند" [1]

اس مادہ سے مع ممدوده ۱۲۷۹ھ مستخرج ہوتے ہیں لیکن بقول تسلیم ممدوده کے دو عدد محسوب کرنے کا ہی اگر قاعدہ ہے تو ان کو تصریح کی کیا ضرورت تھی۔ اس سلسلہ کیپٹن منظور حسن لکھتے ہیں کہ "تسلیم خود اعتراف کرتے ہیں کہ وہ پہلے الف ممدوده کے دو عدد لیا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں تحقیق سے ان پر واضح ہوا کہ ایک عدد ہی لینا صحیح ہے۔" [2] یہی سبب ہے کہ تسلیم اپنی تصنیف ہم عدد لغت "عدد التاریخ" معروف بہ "زنبیل تاریخی" جو "مخمس تسلیم" سے بیس سال بعد (۱۳۲۰ھ) شائع ہوئی۔ میں الف ممدوده سے شروع ہونے والے تمام الفاظ میں ممدوده کا صرف ایک عدد ہی شمار میں لیا ہے مثلاً آب (۳) آگ (۲۱) آفاق (۱۸۲) آشیاں (۳۶۲) آسائش (۳۷۲) آفتاب (۴۸۴) آثار (۷۰۲) اور آغاز (۱۰۰۲) عدد کے تحت [3]

دراصل کلیم ہمدانی (م۱۰۶۱ھ) نے اورنگ زیب کی ولادت کے مادۂ تاریخ میں نہیں بلکہ شہزادہ شجاع کی تاریخ تزویج (شادی) کے مادہ:

"مہد بلقیس بسر منزل جمشید آمد" [4] ۱۰۴۳ھ

میں الف ممدوده کے دو عدد حساب میں لئے ہیں لیکن تاوقتیکہ شہزادہ کی شادی کا سال معلوم نہ ہو کوئی ماہر فن اس مادہ سے مطلوبہ سال بر آمد نہیں کرسکتا۔ اہل شگون واقعہ شادی کی تاریخ میں تدخلہ پسند کرتے ہیں [5] لیکن کلیم کے اس قطعہ میں تدخلہ کا کوئی قرینہ بھی موجود نہیں۔

الف ممدوده کے دو عدد اخذ کرنے کی ایک اور مثال مشہور خطاط آقا عبدالرشید دیلمی شاہجہانی اور مرزا محمد علی بیگ صائب کے مادہ وفات میں ملتی ہے۔ دونوں کا انتقال ۱۰۸۱ھ میں ہوا تھا۔ صاحب کے شاگرد سعیدائے اشرف نے شہزادی زیب النساء کی فرمائش پر ۲۰ اشعار پر مشتمل مرثیہ کہا۔ جس کا تاریخی شعر ہے۔

گفتم از ارشاد پیر عقل در تاریخ آں　　　بود باہم مردن آقا رشید و صائبا [6] ۱۰۸۱ھ

---

[1] ملہم تاریخ صفحہ ۳۸　　[2] فن تاریخ گوئی صفحہ ۱۳　　[3] دیکھئے زنبیل تاریخی میں اعداد کے تحت مختلف صفحات، مطبع نیر اعظم مراد آباد ۱۳۲۰ھ

[4] برائے مکمل قطعہ ملاحظہ ہو بزم تیموریہ ۲:۱۷۸ مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اعظم گڑھ ۱۹۸۴ء

[5] اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۸:۱۷۸

[6] صحیفۂ خوشنویساں از مولوی احترام الدین شاغل عثمانی صفحہ ۱۵۲، ترقی اردو بیورو، اکتوبر، دسمبر ۱۹۸۷ء

مادہ کے لفظ 'آقا' میں الف ممدودہ کے دو عدد لیکر تاریخ مکمل کی گئی ہے لیکن دو عدد شمار کرنے کا کوئی اشارہ نہیں۔ اس صورت میں مادہ مغالطہ کو دعوت دیتا رہے گا۔ اگرچہ یہ سانحہ ۱۰۸۱ھ ہی کا ہے۔ جیسا کہ صائبؔ کی وفات سے متعلق ایک دوسرے مادہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے:

"صائبؔ وفات یافت"[۱] ۱۰۸۱ھ

عبدالکریم سوز ابن صہبائی نے استاد ذوقؔ کی رحلت (۱۲۷۱ھ) پر ۲۴۹ شعر کا ایک مرثیہ کہا، جس میں تقریباً چالیس تاریخیں بھی ہیں۔ اس مرثیہ کا ایک تاریخی شعر ہے:

اوسنے سنکریوں کہا سو حسرتوں سے ہائے ہائے
"خانہ فردوس میں یوں وہ اب آسودا ہوا"[۲] ۱۲۷۱ھ

اس مادہ میں لفظ "آسودا" کے الف ممدودہ اخذ کرتے ہوئے تاریخ مکمل کی گئی ہے۔ لیکن واقعہ مشہور و معروف مثلاً موت وغیرہ کی تاریخ میں ایک عدد کی کمی کو بھی بعض نے جائز رکھا ہے جیسا کہ اہل شگون رحلت کے باب میں ایک عدد کے تخرجہ یا کمی کو اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن تاریخ گوئی میں شگون سند نہیں ہو سکتا۔ الف ممدودہ کے دو عدد لینا محض ضرورت تاریخ کا تقاضا اور تعمیہ (تدخلہ) سے بچنے کا سہل طریقہ ہے۔ سید نورالحسن خاں بلگرامی (م ۱۲۰۹ھ) کے انتقال کا مادہ بھی الف ممدودہ کے دو عدد حساب میں لینے کے بارے میں بہت مشہور ہے:

نوشت خامہ کہ "آغاز بود ماہ صیام"[۳] ۱۲۰۹ھ

اس مادہ میں الف آغاز کے دو عدد لئے گئے ہیں جو بقول مشفق رضوی عماد پوری، "یہ مشرب نہایت ضعیف اور ضرورت تاریخ اس کا منشا ہے۔[۴] "حساب کی مد سے خارج ہے" اس فن کے مسلم الثبوت استاذ سید محمد علی جویا کہتے ہیں کہ "آمد میں دو الف ہیں"[۵] لیکن وہ الف ممدودہ والے الفاظ سے جس قدر تاریخیں بر آمد کرتے ہیں ان میں ممدودہ کا صرف ایک ایک عدد ہی شمار کیا مثلاً:

---

۱ لیکن علامہ غلام علی آزاد بلگرامی صائبؔ کی وفات کا سنہ ۱۰۸۰ھ بتلاتے ہیں اور یہ مادہ لکھتے ہیں: "بلبل گلزار جنت صائب عالی کلام" ۱۰۸۰ھ دیکھیے مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۱۰۱

۲ گلستان سخن از مرزا قادر بخش صابر صفحہ ۲۲۵، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۳ امیر اللغات صفحہ ۱۰ کالم ۲ نیز مہذب اللغات ۱:۸۱۴ کالم ۱

۴ گنجینۂ تواریخ صفحہ ۵ ۵ خیابان تواریخ صفحہ ۷

"خوشی سے پڑھوں آج وہ مثنوی" ١٨٧٠ء کہ غیرت میں ہم آپ ہو ماہ کی ١٨٧٠ء

یا: "ہواب طلوع آفتاب ریاست" [1] ١٢٨٥ھ

مولانا نظامی کی تاریخ رحلت "فردوس آرام" (٥٩٢ھ) اور بادشاہ شاہ عالم کی وفات کا سال "ہادی آخرت" (١٢٢١ھ) سے برآمد کیا ہے۔ [2]

میر تذر علی درد کاکوروی کی رائے ہے کہ: "الف ممدودہ کے دوعدد لینا بہتر ہے بلکہ اگر دوعدد لینے سے تاریخ نکلتی ہو تو دوعدد لیں اور اگر ایک عدد لینے سے تاریخ نکلتی ہے تو ایک عدد لیں تاکہ حتی الامکان تاریخ میں تعمیہ وغیرہ کا جھگڑا پیش نہ آئے کیونکہ اکثر صرف ایک عدد کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے تدخلہ یا تخرجہ کرنا پڑتا ہے۔" [3]

درد صاحب کے بیان میں قطعیت نہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ ایک ایسے قاعدے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس میں "اصول" سے زیادہ "ضرورت" کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اور قاعدہ کو سہولت کی خاطر قربان کردیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا حضرات کے برعکس دیگر اساتذہ و محققین کی آرا بھی یہاں پیش کرنا مناسب ہوگا۔ مولانا نجم الدین حسن افضل مدراسی الف ممدودہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "حرف ہمزہ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی (مراد اردو) زبان میں جب کبھی کلمے کے درمیان الف سے پہلے واقع ہو اور کتابت میں نہ آئے تو اس کی علامت عربی اور ترکی میں کھڑے زبر کی طرح چھوٹے الف کی صورت الف کے اوپر لکھتے ہیں جیسے اُبا، اُدم اور فارسی اور ہندی (اردو) میں ایک چھوٹا سا ٹیڑھا خط جسے مد کہتے ہیں اس الف کے اوپر جسے ممدودہ کہتے ہیں، لکھ دیتے ہیں، جیسے 'آباد اور آزاد اور آمدن، اور ایسا ہمزہ جو کوئی حرف ہی نہ ہو حساب جمل میں محسوب نہیں ہوتا۔ [4]

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی بھی الف ممدودہ کا ایک ہی عدد شمار کرنے کا حکم صادر کرتے ہیں۔ [5] ولا مدراسی [6] اور جلال لکھنوی [7] کی بھی یہی رائے ہے کہ الف ممدودہ کا ایک ہی عدد حساب میں لینا چاہئے۔ نواب سید محمد جعفر علی خاں شمس آبادی کہتے ہیں کہ "ملحوظ خاطر رہے کہ

---

[1] خیابان تواریخ صفحہ ١١٠ و ٢٧ [2] ایضاً صفحہ ١١١ و ١١٦

[3] مقالہ "فن تاریخ گوئی" مشمولہ شاعر آگرہ جولائی ١٩٣٢ء صفحہ ١٥

[4] و [5] بحوالہ غرائب الجمل صفحہ ٨٣ [6] ایضاً صفحہ ٨٢ و ٨٣

[7] افادۂ تاریخ صفحہ ٩

متاخرین الف ممدودہ کا ایک عدد لیتے ہیں اور یہ نحیف بھی اسی پر عامل ہے۔"[1] ذیل میں ایسی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن میں زیر بحث حرف کے استعمال میں ایک عدد ہی گنتی میں لیا گیا ہے۔

شیر شاہ سوری (م ۹۵۲ھ) کا مادۂ وفات میر عزیز اللہ قزوینی نے ع

گفت تاریخ او "ز آتش مرد"[2]

سے بر آمد کیا جس میں ممدودہ کا ایک عدد شمار کیا گیا ہے۔ شہزادہ سلیم کی ولادت (۹۷۷ھ) کے موقعہ جشن پر خواجہ حسن ثنائی مروی (م بعد از ۹۷۹ھ) نے صنعت ترصیع میں ایک طویل قصیدہ کہا جس کے تمام اشعار کے مصاریع اولیٰ سے اکبر کا سال جلوس ۹۶۳ھ اور ثانی مصرعوں سے شہزادہ سلیم کی ولادت کا سال نکلتا ہے جس کے کئی اشعار میں الف ممدودہ والے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اور ہر جگہ ایک عدد ہی اخذ کیا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال ملاحظہ کیجئے:

"طائر از آشیان جاہ وجود آمد فرود" ۹۶۳ھ

"کوکبے از اوج عز و ناز گردید آشکار"[3] ۹۷۷ھ

اس شعر میں وارد 'آشیاں، آمد اور آشکار" کے ممدودہ کا ایک عدد حساب میں لیتے ہوئے مطلوبہ سال بر آمد کیا ہے۔ جس طرح خواجہ حسین مروی نے صنعت ترصیع میں قصیدہ کہا، اسی طرح شہزادہ مراد ابن اکبر کی پیدائش پر قاسم ارسلاں متوفی ۹۹۵ھ نے اسی صنعت میں تاریخ کہی جن کے پہلے مصرع سے سلیم اور دوسرے سے مراد کا سال تولد پیدا ہوتا ہے۔

"آں دوم فرزند اکبر بادشاہ آیتے نازل شدہ از آسماں"[4]

۹۷۷ھ ۹۷۸ھ

یہاں بھی ممدودہ کا ایک ایک عدد (آیتے، آسماں) ہی اخذ کیا گیا ہے واضح ہو کہ ملا عبد القادر بداؤنی (م ھ) کہتے ہیں کہ وہ (قاسم ارسلاں) تاریخ گوئی میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا (دریافتن عدیل نہ داشت)[5] شہزادہ سلیم کی شادی (۹۹۳ھ) کے موقع پر فیضی نے تاریخ کہی۔ جس کے ہر مصرع سے سال بر آمد ہو رہا ہے:

---

[1] مہر نیمروز خاقانی صفحہ ۲ [2] تاریخ داؤدی از عبد اللہ صفحہ ۱۵۹

[3] مآثر جہانگیری صفحہ ۵ [4] دربار اکبری از محمد حسین آزاد صفحہ ۵۵۳ طبع لاہور

[5] منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۸۷ مصنفہ ملا عبد القادر بداؤنی بتصحیح مولوی احمد علی کالج پریس کلکتہ طبع شدہ ۱۸۶۹ء

"زیرپروردنِ آفتابِ دول" ۹۹۳ھ

"قرانے شدہ ماہ وناہید را"[۱] ۹۹۳ھ

جب شہزادہ شہریار کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی تو خود شہزادہ نے تاریخی رباعی کہی، جس کا حامل تاریخ مصرع ہے:

بگو کور شد دیدۂ آفتاب[۲] ۱۰۳۷ھ

غالب کی وفات پر بال مکند بے صبر نے جو قطعہ کہا اس کا تاریخی شعر ہے:

پرسید از دل سن رحلتش　　بنالید و گفت: آہ غالب بمرد[۳] ۱۲۸۵ھ

مذکورہ تاریخوں میں "آفتاب اور آہ" میں ممدودہ کا ایک عدد شامل تاریخ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ "آب، آم، آگ" وغیرہ کے شروع کا الف، مد کے ساتھ آیا ہے۔ یعنی ممدودہ ہے اور تلفظ میں بھی مکرر آتا ہے مگر چونکہ دوبار نہیں لکھا جاتا، اس لئے صرف ایک الف شمار ہوگا۔[۴] ان تمام مثالوں سے واضح ہوگا کہ الف ممدوہ کے عدد کے متعلق شدید اختلاف رائے ہے۔ مگر ترجیح ایک عدد کو ہے۔

(۲) الف مقصورہ: یہ وہ الف ہوتا ہے جو یائے مجہول یا معروف پر ختم ہونے والے الفاظ کی "یا" (ے، ی) پر بنادیا جاتا ہے۔ جسے الف خنجری بھی کہتے ہیں جو مکتوبی نہ ہوکر محض ملفوظی ہوتا ہے اور چونکہ تاریخ گوئی کی بنا کتابت پر ہے اس لئے عیسیٰ، موسیٰ مصطفیٰ اور اس قبیل کے دیگر الفاظ میں "ی" کے عدد لئے جائیں گے کھڑے زبر (الف) کے نہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ بعض الفاظ اردو میں ایسے نظر آئیں گے جن میں اگرچہ کوئی حرف کسی نہ کسی شکل میں اوپر یا نیچے یا شروع یا آخر میں مکتوب ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے اعداد شمار نہیں کئے جاتے وجہ یہ ہے کہ اردو میں تاریخ گوئی کی اساس عربی املا پر ہے۔ اور عربی الفاظ کے املا میں، اس قسم کے حروف بطور اصل شمار نہیں کئے جاتے اسی لئے عیسیٰ اور موسیٰ، سمٰوات وغیرہ کی "ی" پر جو الف لکھا گیا ہے وہ تاریخ گوئی میں محسوب نہ ہوگا۔"[۵] دیگر اساتذۂ فن نے بھی الف مقصورہ کو

---

[۱] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۴۵۱

[۲] صبح گلشن مولفہ سید علی حسن خاں قنوجی صفحہ ۲۳۹ مطبوعہ فیض شاہجہانی بھوپال شوال ۱۲۹۵ھ

[۳] غالب کا ایک مشاق شاگرد بال مکند بے صبر از کالی داس گپتا رضا صفحہ ۱۲ و ۴۶ ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ ممبئی ۱۹۹۲ء

[۴] و [۵] فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت صفحہ ۱۳

غیر محسوب تسلیم کیا ہے۔ البتہ لفظ "یحیٰ" میں اختلاف ہے کہ اس میں دو یا (ی) مانی جائیں یا تین چونکہ قرآنی املا تین "یا" (ی) کے ساتھ ہے[۱] اس لئے اس کے ۳۸ عدد شمار کئے جائیں گے۔ چنانچہ بیشتر اساتذہ نے ۳۸ عدد ہی اخذ کئے۔[۲] لیکن بعض مثلاً تسلیم سہوانی اور میر نادر علی رعد نے اس لفظ کو ۲۸ عدد کے تحت لکھا ہے۔[۳] حافظ الٰہی بخش شائق اور میر مہدی حسین رضوی آلم ۲۸ اور ۳۸ عدد کے ذیل میں لکھتے ہیں۔[۴] ان سے مختلف ابرار ہاشمی اور ڈاکٹر سید احمد کے نزدیک لفظ "یحیٰ" کے ۳۸ عدد ہوتے ہیں۔[۵] اس اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لفظ "یحیٰ" کے آخر میں الف مقصورہ بصورت یائے تحتانی ہے جو کتابت میں رہتا ہے اور تلفظ میں بسبب اجتماع ساکنین گر جاتا ہے۔ اگر اسے ہم بشکل دو یا (یحیٰ) لکھیں گے تو "یحا" ہو گا نہ کہ "یحیا" کیوں کہ اس قسم کے الفاظ میں الف مقصورہ اپنے ماقبل حرف سے مل کر آواز دیتا ہے جیسے مرتضیٰ وغیرہ میں عہد جدید کے مسلم الثبوت تاریخ گو حضرات نے "یحیٰ" کے ۳۸ عدد ہی تسلیم کئے ہیں۔ ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب فرماتے ہیں کہ "یحیٰ کے ۳۸ عدد لئے جائیں گے یہ اساتذۂ تاریخ کا فیصلہ ہے" ڈاکٹر عبدالرب عرفان قدرے وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس طرح علیٰ یا عیسیٰ کا آخری حرف "ی" صرف الف مقصورہ کی آواز بن کر رہ گیا ہے اسی طرح "یحیٰ" لکھنے کی صورت میں بھی حرف "ی" الف مقصورہ کی آواز دیتا ہے (چنانچہ) اس لفظ "یحا" تو پڑھا جا سکتا ہے "یحیا" نہیں۔ یحیٰ میں تین (ی) ہیں۔[۶] ان حضرات کو تاریخ گوئی کے اصول وضوابط پر بھی عمیق بصیرت حاصل ہے۔ بہر حال اس لفظ (یحیٰ) کے عدد اخذ کرنے میں "مصحف عثمانی" کا املا ہی فیصلہ کن ہو سکتا ہے جس تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔

۱۔ القرآن ۳:۳۹، ۶:۸۵، ۱۹:۷ و ۱۲ نیز ۲۱:۹۰

۲۔ دیکھئے مخبر الواصلین از مظہر الحق شاہجہانی (م ۱۲۰۶ھ) صفحہ ۳۵ مطبوعہ ۱۲۶۵ھ مطبع مصطفائی لکھنو، خزانۂ عامرہ از غلام علی آزاد بلگرامی صفحہ ۶۴ کنز تواریخ (مجلد تواریخ) از شاہ محمد غلام یحیٰ یحیٰ عظیم آبادی صفحہ ۸ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۲ء صحیفۂ خوش نویساں صفحہ ۸۶، گلبن تاریخ صفحہ ۶ ملہم تاریخ صفحہ ۵ نیز برائے تفصیل ملاحظہ ہو مضمون تاریخ گوئی میں لفظ یحیٰ کے عدد از عبدالرؤف خاں مشمولہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اپریل ۱۹۹۵ء صفحہ ۲۷۰ [illegible]

۳۔ زنبیل تاریخی صفحہ ۶ نیز مرأت الخیال صفحہ ۶

۴۔ آئینہ تواریخ (تحفۂ شائق) صفحہ ۸ تا ۱۳ مطبع انتظامی کانپور ۱۳۱۲ھ اور گلبن تاریخ صفحہ [illegible]

۵۔ فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت صفحہ ۷۴ نیز لغات ابجد شماری ۱:۲۶۷

۶۔ دیکھئے بالترتیب مکتوب مورخہ ۲۹ ۶/۹۵ اور مکتوب مورخہ ۲۵ ۷/۹۵۔

۳۔ کھڑا زبر: کھڑا زبر بعض عربی الفاظ کے درمیان میں لگایا جاتا ہے جیسے اسمٰعیل، رحمٰن، تھمٰن وغیرہ میں ان الفاظ میں کھڑے زبر کا عدد شمار کیا جائے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں تسنیم سہوانی لکھتے ہیں کہ:

"کتب معتبرہ سے دریافت ہوا کہ الف اسحٰق بعد "حا" کے اور الف رحمٰن و سلیمٰن و اسمٰعیل وسمٰوات بعد میم کے محسوب نہیں ہوگا۔"[۱] اس قول کے مدنظر درج ذیل تاریخ ملاحظہ فرمائیں۔

ہاتفِ شامِ غریباں با دو چشم خوں فشاں
گفت "ابراہیم، اسمٰعیل را قرباں نمود" [۲] ۱۱۲۴ھ

لیکن ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ کھڑے زبر کو محسوب کیا گیا ہے مثلاً خانِ دوراں نواب درگاہ خاں درگاہ نے نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کی شہادت کی تاریخ میں لفظ "رحمٰن" کے کھڑے زبر کو شامل تاریخ کیا ہے، تاریخی مصرع ہے:

"اولادِ علی شہید کردہ ایں جا۔ عبد الرحمٰن" ۱۱۷۱ھ

نواب درگاہ قلی [illegible] لچھمی نارائن شفیق نے جب سراج اورنگ آبادی کی وفات کا قطعہ سنایا [illegible] کا حامل تاریخ مصرع ہے:

"[illegible] رو بر حمٰن نمود شاہِ سراج" ۱۱۷۷ھ

تو درگاہ قلی نے اعتراض کیا کہ "ایں الف (رحمٰن کا کھڑا الف) رانی تواں حساب کرد کہ [illegible] قاعدۂ جمل معتبر حروف مکتوبی است نہ ملفوظی عرض کردم کہ در تاریخ کہ آنجناب شہادتِ [illegible] صمصام الدولہ شاہ نواز خاں مرحوم کہ در (۱۱۷۱ھ) از دست عبد الرحمٰن نامی واقع شد یافتہ [illegible] الف رحمٰن محسوب نمی کنند یک عدد کم می شود۔"[۳] مزید مثالوں سے قطع نظر اس قبیل کے دوسرے الفاظ کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہئے۔　　　　(باقی آئندہ)

---

[۱] [illegible] تاریخ صفحہ ۴۰

[۲] [illegible] السلاطین ترجمہ سیر المتاخرین از منشی گوکل پرشاد سری واستو ۲: ۴۴۳ مطبع نولکشور لکھنو ۱۸۸۲ء اس تاریخ کا [illegible] ذوالفقار خاں (اصل نام محمد اسمٰعیل) ابن وزیر اعظم اورنگ زیب عالمگیر اسد خاں (اصل نام محمد ابراہیم) [illegible] ۱۱۲۴ھ / ۱۰ / جنوری ۱۷۱۳ء کو جہاندار شاہ کے ساتھ شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ اس [illegible] نواب محمد ابراہیم اسد خاں نے یہ تاریخ خود کہی دونوں کے مختصر حالات کے لئے دیکھئے تذکرہ [illegible] صفحہ ۱۰۱ مطبوعہ ۱۹۸۵ء نئی دہلی۔

[۳] [illegible] تذکرہ گل رعنا ورق ۲۵۵ الف مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی مکتبہ [illegible] اردو بازار دہلی ۶

اُردو کی جدید شاعری اور اقبال

از جناب مولوی رفعت احمد خاں صاحب ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج المورٹہ

خالق عالم نے نظام کائنات کو عجیب کمال سے ہم آغوش کیا ہے۔ جہاں فطرت کی مختلف کیفیات، قدرت کی دلفریبیاں، مظاہر و آثار کی دلچسپیاں اور موجودات کے گوناگوں سوانح اور بوقلموں واردات انسان کے محسوسات میں تحریک اور ہیجان کے باعث ہوتے ہیں۔ وہ ان موجودات کی حسن وخوبی سے متاثر ہوتا ہے اور مختلف واردات وواقعات سے اس کے قلب میں طرح طرح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جن کے سچے اظہار سے شعر کی تخلیق اور اس کے حسن وقبح کی تصدیق ہوتی ہے۔ دراصل انسان اپنے تاثرات کو متخیلہ کی مدد سے علم یا فن کی صورت میں ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ جن کے لئے وہ ان فطری اور ذہنی قوتوں کا محتاج ہے، جو خالق حقیقی نے اس کو ودیعت کی ہیں۔ فنون لطیفہ کا مذاق بھی ان ہی میں سے ایک قدرتی عطیہ ہے۔ شاعری بہ نسبت دیگر فنون جمیلہ کے ذہنی اور خارجی واردات اور نفس انسانی کی گہری اور بوقلموں کیفیات کی زیادہ صحیح تصویر پیش کر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔

شعر کی اہمیت اور شاعر کا پیغام

شاعر کی انقلاب انگیز قوت کا اندازہ تاریخی شواہد سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جس وقت عربی شاعری اپنے فطری رنگ میں جلوہ گر اور سادگی اور بے ساختگی سے ہمکنار تھی اس وقت ایک بڑی حد تک شعراء بھی ملک پر حکومت کرتے تھے۔ قوم کے سیاسی نظام۔ تمدنی اور اخلاقی اصلاح اور علم وفن کی ترقی کے وہی باعث تھے۔ شعر ایک حیرت انگیز قوت کے مرادف تھا، اور شاعر کا احترام ایک حکمراں سے ہرگز کم نہ تھا۔ انگریزی شاعری میں بھی ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ چنانچہ شیلی (SHELLEY) کے فلسفۂ حیات اور سیاسی خیالات نے ملک میں ہلچل مچا دی تھی۔ ورڈس ورتھ (WORDSWORTY) نے اپنے ہم وطنوں کی مادہ پرستی کی مذمت کر کے ان

کو قدرت کے دلکش اور سبق آموز مناظر کی جانب مائل کیا۔ براؤننگ (BROWNING) کی نظموں نے سیاسی دنیا میں تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ ایرانی شاعری بھی اس عملی قوت سے بالکل خالی نہیں کہی جاسکتی۔ شیخ سعدی، خواجہ حافظؒ مولانا رومؒ اور دیگر شعراء نے دنیا کو جو درس اخلاق و تصوف دیا ہے، محتاج بیان نہیں۔ شاعری کی عملی قوت کے اثرات کو صرف جنگ و پیکار کے آئینہ میں دیکھنا غلطی ہے۔ البتہ اردو شاعری اس اثر و قوت سے مدتوں محروم رہی۔ قصائد کاسئہ گدائی بن گئے اور غزل ایک معجون مرکب ہو کر رہ گئی۔ نہ حدود تغزل متعین رہیں۔ نہ نوعیت مضامین، نہ جذبات کی اصلی ترجمانی باقی رہی، نہ محسوسات کی سچی تصویر۔ رفتہ رفتہ تصنع اور تکلف نے سادگی اور صداقت کی جگہ لے لی۔ اردو کی جدید شاعری میں اقبال کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ انہوں نے صرف غزل میں منتشر خیالات نظم کرنے کے بجائے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک خوابیدہ ملت کو بیدار کیا، اور فلسفہ خودی سمجھا کر درس عمل دیا، ان کی شاعری دراصل ''پیغام عمل'' کے مرادف ہے، جس کا درس بھی وہ عین فطری اور نفسیاتی طریقہ پر بتدریج دیتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے ان کے فلسفیانہ پیام کے مدارج اور تدریجی تعلیم کا اجمالاً اندازہ ہو سکتا ہے۔

ملت خوابیدہ کا شکوہ

اڑتی پھرتی ہیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں　　　دل میں کیا آئی کہ پابند نشیمن ہو گئیں
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت　　　اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے

پیام بیداری اور فلسفہ خودی

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو　　　قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہوں تسخیر بے تیغ و تفنگ　　　تو اگر دیکھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

تلقین عمل اور سعی و جستجو

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے　　　چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے

یقین کامل عمل پیہم، محبت فاتح عالم		جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود		پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے		یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

اقبال کا یہ تمام فلسفہ ان ہی اسلامی تعلیمات کو شاعرانہ پیرائے میں پیش کرتا ہے جو ہمیں قرآن کریم اور احادیث پاک سے حاصل ہوئی ہیں اور جن کی تفصیل اقبال کے فلسفہ حیات پر تفصیلی تنقید کے ضمن میں شاید ناظرین آئندہ ملاحظہ کریں۔ جس سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ شاعر نے اسلامی فلسفہ عمل کو کس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔

علاوہ پیغام عمل دینے کے جدید فلسفیانہ خیالات بھی اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن سب فلسفۂ اسلام کے تابع ہیں۔ جس سے شاعر کے جذبۂ ملی اور محبت اسلام کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً اخوت و ہمدردی کی تعلیم اس طریقہ پر دیتے ہیں۔

شاہد قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو

سر میں جز ہمدردیٔ انساں کوئی سودا نہ ہو

یہ بھی ایک حدیث شریف کے مضمون کی ترجمانی ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ انسانوں میں بہتر شخص وہ ہے جو دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچائے۔ ایک دوسری جگہ اقبال نے کہا ہے:

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی		اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اردو کی جدید شاعری اور تجدید رومانیت

اردو کی دکنی یا ابتدائی شاعری اپنے سادہ طرز اور جذبات نگاری میں ایک حیثیت سے یوروپ کے قرون وسطیٰ کی شاعری سے مشابہ ہے۔ اس سادگی اور فطری جذبات نگاری کے نمونے "اردو شہ پارے" (مصنفہ ڈاکٹر محی الدین زور) میں بکثرت ملیں گے۔ جس طرح عرب کی شاعری اپنی فطری بے تکلفی اور سادگی کو خیرباد کہہ کر ایک عرصہ تک صرف مدحیہ قصائد پر مبنی رہ گئی تھی اور فارسی شاعری بھی اسی انحطاط پذیر دور کی تقلید کے باعث عرصہ تک تصنیفات ہی میں الجھی رہی۔ اسی طرح شمالی ہند میں اردو شاعری بھی پہلے دور کے بعد ہی

ظاہری تکلفات کا ہدف بن کر رہ گئی۔ یہ طرز شاعری انگریزی شاعری کے کلاسیت (CLASSICISM) کے رنگ سے مشابہ ہے۔ وہاں اگر پوپ (POPE) اور چاسر (CHAUCER) اس طرز کے علمبردار ہیں تو یہاں ناسخ لکھنوی اور ان کے ہمرنگ شعراء کا مرتبہ ان سے ہرگز کم نہیں۔ جس طرح انگریزی شاعری میں اس تصنع آمیز دور کے بعد قرون وسطیٰ کے طرز شاعری کی تجدید کا زمانہ گرے (GRAY) سے شروع ہوتا ہے اور بعد کو بائرن (BYRON) ورڈس ورتھ (WORDSWORTH) شیلی (SHELLY) اور کیٹس (KEATS) وغیرہ اس نئے طرز رومانیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح اردو شاعری میں بھی یہ تغیر رونما ہوا۔ غدر کے قبل ہی نظیر اکبر آبادی نے اپنے کلام اور غالب نے اپنے خطوط میں فطری سادگی اور یہ رومانی اسپرٹ (ROMANTIC SPIRIT) اختیار کی۔ اور بعد ازاں انیس، دبیر، حالی، آزاد، شبلی، مولوی محمد اسمٰعیل، اکبرالٰہ آبادی اور ڈاکٹر اقبال وغیرہ نے اردو شاعری کے چہرہ سے ظاہری تصنعات اور دوراز کار تشبیہات وغیرہ کے بدنما دھبے دور کئے۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری'' اس سلسلہ میں قابل ذکر ولائق مطالعہ ہے۔ انگریزی شاعری میں اس رومانی طرز نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں ترقی کی لیکن ہندوستان میں تحریک تقریباً ایک صدی بعد رونمائی ہوئی۔ اس تحریک کے بعد رفتہ رفتہ انگریزی حکومت انگریزی طریقہ تعلیم اور تہذیب و تمدن اور دیگر اسباب کے باعث اردو شاعری مغربی اثرات قبول کرتی رہی۔ اقبال نے دیگر ''خودرو'' شاعروں کی طرح اس کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ بلکہ اعتدال اور ضرورت کے مطابق اس رنگ کو اختیار کیا اور اس کی تہ میں اپنے ''پیام مشرق'' ''اسرار خودی'' اور جذبہ اسلامی کے بیش بہا موتیوں کو نمایاں رکھا۔ جن کے تابناک لمعات سے چشم مغرب خیرہ ہوئی۔ انگریزی کا مشہور شاعر براؤننگ (BROWNING) کا فلسفہ سعی و عمل اقبال کے مکمل فلسفہ حیات کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اقبال کا دل حقیقتاً ''سراپا ذوق استفسار'' ''صورت سیماب بیقرار'' ''زخمی شمشیر ذوق جستجو'' اور ''مجروح تیغ آرزو'' ہے۔ ان کے نزدیک زندگی اضطراب کا نام ہے ''زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے'' وہ متشائم نظریۂ حیات کو پسند نہیں کرتے، شوپنہار کے فلسفہ یاس و قنوط کے مخالف ہیں۔ اور اسلامی فلسفہ حیات کے حامل ہیں۔

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

اپنے فلسفیانہ تخیلات میں بھی وہ صرف اسلامی فلسفہ ہی کو حقیقی اور فطری خیال کرتے ہیں اور یونان کے حکماء کے گوسفندانہ خیالات اور یورپ کے دیگر فلسفہ داں مثلاً برگسان اور نیٹشے کے حقیقت ناآشنا نظریات کو باطل جانتے ہیں۔ یہ ان کے علو خیال اور اسلامی فلسفہ سے دلچسپی کی بین دلیل ہے جس میں ابتہاج ومسرت اور امید ورجائیت کے ہمت افزا تخیلات ہر جگہ نمایاں ہیں۔

جدید اثرات

اردو شاعری میں تجدید رومانیت کے ساتھ ساتھ جو تغیرات رونما ہوئے اقبال کی شاعری ان خصوصیات کو عجیب دلکش پیرایہ میں پیش کرتی ہے۔ اقبال کی شاعری اپنے عہد کے معاشرتی، تمدنی اور مذہبی حالات کی آئینہ دار ہے۔ نقد ادب کے جدید اصول کے مطابق ان کی شاعری درحقیقت ''تنقید حیات'' ہے۔ اس وصف کی اردو شاعری میں بہت کمی ہے۔ کیونکہ وہ ایک عرصے تک ''سرگشتہ خمار رسوم وقیود'' رہ چکی ہے۔ اسی سبب سے اس میں مختلف ازمنہ کے معاشرتی حالات نمایاں طور پر ظاہر نہیں ہونے پائے جن سے شاعری کے جذبات کی صداقت پر کافی روشنی پڑ سکے۔ اقبال کے عہد میں سیاسی تحریکات، معاشرتی اصلاحات، قومیت کی ترقی، مذہبیت کا تنزل، مادیت ومغربیت کا عروج، عالمگیر اقتصادی انتشار مساوات وآزادی کا زور، افادیت وحریت کا شعور، اسلامی دنیا کے زوال پذیر واقعات اور دردانگیز حالات اور اسی نوع کے دیگر اثرات نے ان کو بالآخر ایک سچا قومی اور اسلامی شاعر بنادیا۔

نیچرل سادگی کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ

سادگی اور صداقت اظہار کے باعث جو رومانیت کا خاص امتیاز ہے اقبال کی شاعری کا سرمایہ ناز ہے۔ اور یہ وصف جو اردو شاعری کے دکنی یا ابتدائی دور میں جلوہ گر ہے عہد حاضر کے دوسرے شعراء کے کلام میں بھی مفقود نہیں۔ دراصل سادگی ایک فطری شے ہے جو تکلیف

سعی و کاوش اور آورد سے کوسوں دور ہے۔ ورنہ تکلیف اور فطری سادگی جو باہم متضاد ہیں مترادف قرار پائیں گے۔ یہ امر بھی ناقدین کی حقیقت شناس نگاہوں سے پوشیدہ نہیں کہ عصر حاضر کے کچھ نام نہاد شعراء انگریزی ادب کی غلط اور کورانہ تقلید کی وجہ سے غیر شاعرانہ مضامین کو ٹھیٹ دیہاتی الفاظ میں ادا کر کے جدید شاعری کے علمبر دار بننا چاہتے ہیں لیکن نتیجہ معلوم! چونکہ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے جس کے لئے ایک مبسوط مضمون کی ضرورت ہے اس لئے پھر کبھی اس پر ماضی و حال کی شاعرانہ خصوصیات نمایاں کر کے شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے گی۔

رومانیت کی تجدید دراصل قدیم سادگی کی تجدید ہے۔ یورپ میں بخلاف جرمنی اور انگریزی ادیبوں کے فرانسیسی ادیبوں کا یہ خیال تھا کہ تجدید رومانیت دراصل قدرت کے وسیع میدان کی طرف ترغیب کے مرادف ہے۔ اس اعتبار سے اردو شاعری میں اس تحریک کے مجدد فن دراصل نظیر اکبر آبادی ہیں لیکن افسوس! ان کی بے نظیر نظمیں نیچرل سادگی اور ترجمانی قدرت کے باوجود ماحول کی ناموافقت کے باعث قدر کی نگاہوں سے نہ دیکھی گئیں اور اپنی قدر و منزلت کے لئے نوابی عہد کے اختتام اور دور جدید اور خصوصاً انگریزی شاعری کی آمد کی منتظر رہیں۔ اقبال بھی قدرتی شاعری میں اپنی نظموں کو فطرت سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔

شاعر کا امتیاز

اس میں شک نہیں کہ میر کے رنگ تغزل اور سوز و گداز۔ داغ کی سادگی اور اکبر کی ظرافت کی طرح ہر شاعر کا ایک فطری رنگ ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے کلام کی یہ امتیازی خصوصیت اسلامی تعلیم کی ترجمانی میں فلسفہ کی فراوانی ہے۔ یہ فلسفیت ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ اور کسی خاص صنف سخن کی پابند نہیں۔ اس لحاظ سے ان کے اشعار شیلی (SHELLEY) کے نظریہ شعر کے مطابق "متخیلہ کے انکشافات" ہیں جن میں فلسفیانہ سرمستی ہر جگہ جلوہ گر ہے۔

اثر جدید اور ترک غزل گوئی

دور جدید کی دیگر خصوصیات کے ساتھ اقبال نے بھی غزل کے پامال اور فرسودہ میدان کو

ترک کیا، لیکن غزلوں کا جس قدر ذخیرہ بھی موجود ہے وہ فلسفیانہ تخلیات جدید تراکیب اور و تشبیہات اور نشست الفاظ کے باعث غالب کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ بعض غزلوں میں داغ کی سادگی صاف جھلکتی ہے جو داغ کے ساتھ ایک مختصر سے سلسلۂ تملذ کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن بہ نسبت داغ کے غالب کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی معنی آفرینی، جدت طرازی اور رنگین بیانی ان کو عصر جدید کے دیگر شعراء سے ممتاز کردیتی ہے۔ اعلیٰ مضامین کے اظہار میں غالب کی طرح ان کی غزلیں جس طرح ترنم ریز ہیں اسی طرح جذبات سے لبریز ہیں۔ کارلائل (CARLYLE) کے نظریۂ شعر کے مطابق ان کے کلام میں موسیقی اور شاعری دوش بدوش ہیں۔ ان کی مختصر غزلیں بھی حسن وحقیقت کی تفسیر اور حیات انسانی کی تنقید ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں کیونکہ اس مختصر مضمون میں شرح وبسط سے تنقید کی گنجائش نہیں ہے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفوبندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

عشق ہے فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنئ پیغام ابھی

کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہ گزر میں نقش کف پائے یار دیکھ

نظارہ کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کشادہ دست کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی؟

جدید تاثرات اور کلام کی خصوصیات

گہوارہ سخن کی اس جدی جنبش کے ساتھ ساتھ اقبال نے بھی غزل کو ترک کیا اور قدرتی، اخلاقی، تاریخی، معاشرتی، قومی اور ملی نظموں کی طرف توجہ کی، اور مسدس اور مثنوی وغیرہ

کے دامن کو اپنے فکر و تخیل کے گوہر ہائے آبدار سے زینت بخشی کیونکہ انہی اصناف سخن میں مسلسل مضامین بآسانی نظم ہو سکتے تھے۔ اور وہ اپنے پیام زریں کو دنیا کے سامنے شرح وبسط کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ جدید طرز سخن کے علمبردار ہونے کے باوجود انہوں نے انگریزی شاعری کی کورانہ تقلید نہیں کی اور ردیف و قافیہ وغیرہ کو خیرباد کہہ کر صرف پیش پا افتادہ مضامین کو نظم کر کے اپنے کلام کو "بازیچۂ اطفال" نہیں بنایا بلکہ مشرق کے وقار و وقعت۔ مذہب اور فلسفیت کو قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اغراضیت "مغربیت" کی نظر فریب گھٹاؤں میں بھی برق کی طرح چمکتی ہے جس پر امیر مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

بلاد اسلامیہ کی پرانی عظمت وشان، مغرب کے سفر اور یورپ کے مختصر قیام نے شاعر کے دماغ کو ایک بڑی حد تک متاثر کیا۔ ایک طرف تو وطن کے دیوتاؤں کی پرستش کے بجائے اسلامی اتحاد و مرکزیت کے پرستار اور "جذبۂ ملی" کے ترجمان بن گئے اور یورپ کے سطحی فلسفیانہ نظریات، تہذیب و تمدن کے ناگفتہ بہ حالات اور اقتصادی اور سیاسی ہیجان وانتشار دیکھ کر "مغربیت" کا گہرا اثر ڈالا۔ ایران کی صوفیانہ شاعری نے جو جرمنی میں ان کے مقالہ کا خاص موضوع تھی ان کے مذاق تصوف کو عروج پر پہنچادیا۔ درحقیقت اقبال کی فلسفیانہ سرمستیوں کا راز ایک بڑی حد تک انہی ایرانی میخانوں کی سیر میں پنہاں ہے۔ جہاں ہزاروں سرخوش پڑے جھوم رہے ہیں۔ جن میں مولانا روم کا اسم گرامی خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ انہی کے مقدس کلام نے نکات تصوف، اسرار خودی اور رموز بے خودی سے اقبال کے شوق آگیں قلب کو مالا مال کیا جن کو اقبال کی صوفیانہ شاعری پر تفصیلی تنقید کرتے وقت دوسرے مضمون میں وضاحت و تحقیق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس وقت اقبال کے مغربی تاثرات کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

(۳) انہی تاثرات کے باعث انہوں نے انگریزی شاعری کے طرز جدید، نیچرل مضامین کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ مثال کے طور پر ان کی نظموں کے چند عنوانات لکھے جاتے ہیں جن میں اس قسم کے مضامین بھی ہیں۔ کنار راوی، ہمالہ، کوہسار، ایک شام، موٹر، گل رنگیں، پرندے کی فریاد، وغیرہم۔ انہوں نے کنگھی، چوٹی اور زلف وکاکل کے مضامین اور دیگر لفظی

تصنعات سے اپنے کلام کو محفوظ رکھا۔

(۳) انگریزی طریقہ پر نیچرل مضامین کے انتخاب ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے۔ بطور نمونہ چند کے نام ذیل میں درج ہیں۔

ایک پہاڑ اور گلہری.....	ماخوذ از ایمرسن	(EMERSON)
ہمدردی	// کوپر	(COSPER)
رخصت اے بزم جہاں	// ایمرسن	(EMERSON)
عشق اور موت	// ٹینی سن	(TENNYSON)
پیام صبح	// لانگ فیلو	(H.W.LONGFELLOW)

(۴) اپنی فارسی مثنویوں یا اردو کی چند نظموں میں جو فلسفۂ مغرب کے جواب یا استرداد میں لکھی گئی ہیں۔ (مثلاً ان کی مثنوی "پیام مشرق" جرمن شاعر گیٹے کے جواب میں لکھی گئی ہے۔) اسلامی فلسفہ کی عظمت اور یورپ کے سطحی تخیل سے نفرت کے جذبات کو عجیب دلنشین پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ تطویل مضمون کے خیال سے اشعار نقل نہیں کئے گئے۔ کیونکہ اس موضوع پر بھی ایک جدا مضمون شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

قدرتی شاعری

اقبال اپنی نظموں میں انگریزی طرز پر نئی تخیلی تراکیب اور اسی نوع کی تشبیہات اور استعارات بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً قرب فراق آمیز دانۂ خرمن نما، انجمن بے خروش نظارۂ خاموش، ہنگامۂ خاموش وغیرہ ان نئی تراکیب کے ساتھ رنگینی تخیل بھی انگلستان سے کسی رومانی شاعر سے خواہ وہ شیلی (SHELLEY) ہو یا ورڈس ورتھ (WORDSWORTH) کم دلکش نہیں ہے۔

چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں صبح صادق سو رہی ہے رات کے آغوش میں

چاندنی کو پھیکا بتلانا، صبح کو رات کے آغوش میں جگہ دینا اور سحر کا عارض رنگین دکھلا کر کلی کے سینۂ زریں کو کھولنا، ورڈس ورتھ کی قدرتی شاعری کی یاد تازہ کرتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو اقبال کا کلام علو تخیل اور رنگینی کے ساتھ فلسفہ کی آمیزش کے باعث اتنا بلند و ارفع ہو گیا ہے کہ ورڈس ورتھ یا کسی دوسرے انگریزی شاعر کے مرغ فکر کی پرواز سے ماوراء ہے۔ یہ

اقبال ہی کا کمال ہے کہ باوجودیکہ انگریزی رومانی طرز کو اختیار کیا، لیکن نہ انگریزی شعراء (مثلاً کیٹس (KEATS)) یا اردو میں ان کے کورانہ مقلدین کی سی عریانی مضامین ان کے یہاں پائی جاتی ہے اور نہ نامانوس الفاظ۔ مثال کے طور پر صرف دو نظموں کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک شام

فطرت بیہوش ہو گئی ہے　　آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے　　پیکر کا خرام بھی سکون ہے

تنہائی

یہ چاند یہ دشت و دریہ کہسار　　فطرت ہے عام نسترن زار
رفعت آسمان خاموش　　خوابیدہ زمیں جہان خاموش
موتی خوش رنگ پیارے پیارے　　یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل　　قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

طرز ادا کی سادگی، تشبیہات کی ندرت، استعارات کی جدت، رنگینی تخیل اور رومانیت کس درجہ ان اشعار سے ظاہر وباہر ہے۔ علاوہ بریں ان سے یہ حقیقت بھی برانگندۂ حجاب ہو جاتی ہے کہ اقبال اپنی قدرتی شاعری میں بھی کوہ و دریا کے خوشنما مناظر اور دشت و صحرا کے دلفریب مظاہر کو ایک عامی کی طرح سطحی نگاہوں سے مشاہدہ نہیں کرتے اور انگریزی شعرا یا اردو میں ان کے کورانہ مقلدین کی طرح صرف ظاہری حسن وخوبی کے فرسودہ بیان پر اکتفا نہیں کرتے۔ اقبال کی شاعرانہ نگاہ میں ایک خاص عمق اور گہرائی ہے۔ جو ان کی حقیقت کوشی کا پتہ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تخیل ورڈس ورتھ word wrth یا انگلستان کے دوسرے قدرتی شاعروں کے تخیلات سے بالاتر ہو کر اور حقیقت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ مظاہر و آثار کی خوشنمائیوں کو سبق آموز حقیقت بنا کر انسان کو توحید کا فطری درس دینا قرآن کریم کا خاص طریقہ تعلیم ہے۔ جس کو اقبال نے جابجا اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔

تردید سرمایہ داری

(۶) اقبال نے عصر جدید کی دیگر تحریکات کے ساتھ وطنیت کی وثنیت اور سرمایہ داری کی

فسوں کاری کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی۔ یورپ کی سرمایہ داری اور قومیت کی مسموم فضا دیکھ کر یہ نقوش اور نمایاں ہو گئے۔ سرمایہ داری کے مہلک اثرات مشاہدہ کر کے مزدور کو یاد کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن اور اقتصاد و سیاست کو ہمدردی و ایثار اور باہمی محبت و امداد کے فقدان کے باعث بنی نوع انسان کے لیے مہلک و مضر خیال کرتے ہیں بلکہ ہوسناکی سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا	جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
وہ حکمت ناز ہے جس پر خردمندان مغرب کو	ہوس کے پنجۂ خونی میں تیغ کارزاری ہے

جذبہ ملی اور وطنیت

اپنے خیالات کی پختہ کاری کے بعد اپنی شاعری کے آخری دور میں وطن کو روشن سمجھتے ہیں جس کی پرستش کرنا جائز قرار دیتے ہیں اور اُپنی ملت کو جغرافیائی حدود میں محصور نہیں دیکھنا چاہتے۔ انہیں تو رسول ہاشمی ﷺ کی ترکیب قوم پسند ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر	خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار	قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہوں	ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کے واسطے
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا	نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

تہذیب حاضر

اکبر الہ آبادی کی طرح تہذیب حاضر اور تمدن مغرب کی نظر فریب فضا کے مہلک اثرات سے متنبہ کرتے ہیں۔ اور جا بجا اسلامی طرز و طریقہ کی ترغیب دیتے ہیں، بلکہ انہیں وثوق و یقین ہے کہ مستقبل قریب میں یہی اسلامی طریقہ مقبول خاص و عام ہو گا۔

تہذیب مغرب

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تمہاری تہذیب اپنی خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی ہوسنا کی

اسلام اس کی جامعیت اور ہمہ گیری جس کمال سے ہم آغوش ہے وہ انسانی فکر کے تخیل کا نتیجہ ہونے سے وراء الوراء ہے۔ اسی سبب سے اس کے اصول ہر ملک و قوم ہر جگہ اور ہر ماحول میں کامیاب رہتے ہیں۔ انہی اصول میں امن و صلح، مساوات و اخوت اور اتفاق و اتحاد کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ اقبال اہل ملت کی معاشرتی، سیاسی، تمدنی، اقتصادی، دینوی اور اخروی فلاح صرف اسلام ہی کے زریں اصول پر منحصر خیال کرتے ہیں۔

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

صداقت جذبات اور یقین و توکل کا یہ عالم ہے کہ اہل ملک کی موجودہ غفلت شعاری سے قطعاً مایوس نہیں ہوتے بلکہ اسلام کے زریں اصول اور توحید و رسالت کے سچے عقائد کو دنیا میں ہر جگہ جلوہ گر دیکھنے کا یقین کامل رکھتے ہیں۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

(باقی)

معاہدہ یہود علمی نقطۂ نظر سے

تکملۂ بحث

(از جناب شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب پروفیسر، دہلی یونیورسٹی)

جنوری و فروری ۱۹۴۰ء کے برہان میں ناظرین میرا ایک مضمون "معاہدۂ یہود علمی نقطہ نظر سے" کے عنوان سے پڑھ چکے ہیں۔ اس مضمون کے متعلق مارچ، اپریل اور مئی کے برہان میں جناب مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنی دوسری طول طویل تنقید شائع فرمائی تو میں نے اس تنقید کی تحقیق شروع کی ایک نمبر کا مواد بھی ادارہ برہان کو پہنچا۔ جواب آیا۔ جواب آپ کا حق ہے لیکن اس "کہا" اور "کہتا ہوں" کے عرض وطول سے برہان کا دامن وسعت تنگ ہے۔ اچھا ہو کہ تحقیق مہمات پر اکتفا کیجئے اور اپنی بحث کے خاتمہ پر اپنی تحقیق کا آخری نتیجہ بھی لکھ دیجئے۔ بات معقول تھی اس لئے میں اپنی لکھی ہوئی تفصیل کو اختصار سے بدلتا ہوں اور "قال" "اقول" کے صفحات کو سطروں میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔

اس دفعہ بھی جناب مولوی صاحب نے اپنی دوسری تنقید کی ابتدا ایک توضیحی تمہید سے فرمائی ہے۔ پہلی دفعہ تمہید کی تحقیق ہم نے ارادۃً چھوڑ دی تھی۔ ہر دفعہ یہ مناسب نہیں اس دفعہ ضرورت بھی اس کی متقاضی ہے کہ اس تازہ تمہید سے بالکل اغماض نظر نہ کیا جائے۔ لئے اصل مسائل زیر بحث سے پہلے میں اس تمہید پر نظر ڈالتا ہوں۔

(۱) اس تمہید میں جناب مولوی صاحب نے جو طریقہ اثبات مدعا اور استدلال کا اختیار فرمایا ہے وہ دنیا جہان سے نرالا ہے۔[۱] عام قاعدہ یہ ہے اور ہونا چاہئے کہ پہلے کوئی مسئلہ یا دعویٰ ہو۔ پھر اس کا حکم اس کے بعد حکم کی دلیل۔ لیکن رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کی حمایت میں جناب مولوی صاحب جس امر کو مصنف رسالہ کا دعویٰ فرماتے ہیں وہ رسالہ میں خود جناب

---

[۱] تحریر میں چونکہ اختصار زیادہ ہے ناظرین برہان بابت مارچ ۱۹۴۰ء پیش نظر رکھیں۔

مولوی صاحب کے بیان اور حوالہ کے مطابق بعد میں آتا ہے (یعنی ص ۶۹۔ ۷۰ پر) اور اس حکم کے طریق تعمیل اور حکم کا استشہاد پہلے (یعنی ص ۴۲۔ ۴۳ پر) اس پر طرہ یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ اصل مسئلہ رسالہ متحدہ قومیت واسلام کا ہے۔ اجنبی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ کرنا مذہبی نقطہ نظر سے واجب ہے، حالانکہ رسالہ "متحدہ قومیت واسلام" کا نہ یہ موضوع ہے نہ اصل مسئلہ، اس کا اصل موضوع اور مسئلہ ہے۔ قیام متحدہ قومیت کا جواز بلکہ وجوب جیسا کہ خود رسالہ کے نام اور اس کے بیانات ذیل سے ظاہر بلکہ اظہر من الشمس ہے۔

(۱) دہلی کی تقریر کا اصل واقعہ اور قومیت متحدہ کا خبر دینا۔

(۲) الفاظ قرآنیہ اور کلمات حدیث کا حل صرف لغات عرب سے ہوگا۔

(۳) قرآن شریف سے قوم کے معنیٰ کی تحقیق۔

(۴) لفظ امت پر بحث۔

(۵) قومیت کے متعلق معنوی ابحاث۔

(۶) اسلام نے پیروی کرنے والوں کے لئے وحدت ملی قائم کر دی ہے۔

(۷) متحدہ قومیت اور وطن سے تنفیر

یہ رسالہ کے اہم ترین ابتدائی ابواب ہیں اس کے علاوہ مصنف نے رسالہ کے پانچویں اور آٹھویں صفحہ میں خود اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ رسالہ کا اصل موضوع متحدہ قومیت اور [illegible] کا مشورہ ہے۔ ضمناً اور باتیں بھی آجائیں گی۔ لیکن جناب مولوی صاحب ان سب باتوں کے باوجود بھی فرماتے ہیں کہ اصل مسئلہ ہے۔ "اجنبی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ کرنا مذہبی نقطہ نظر سے واجب ہے۔ ظاہر ہے کہ جناب مولوی صاحب اصل مسئلہ کو اپنے کسی خاص پیش نظر مدعا کی وجہ سے بدل رہے ہیں۔

(۳) تمہید کے ان نمایاں خدوخال کی تصویر کے بعد اب آیئے جناب مولوی صاحب کی اس تنقید کی طرف جو میرے ایک جملہ کے تحت میں وہ بکمال ہوشمندی لکھتے ہیں، میں نے لکھا تھا۔

"زیر بحث نامۂ نبوی رسالہ متحدہ قومیت میں شرعی حکم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔"

میرے اس قول کی تنقید جناب مولوی صاحب یوں فرماتے ہیں۔

"اس مسئلہ میں دراصل شرعی حکم یہ ہے کہ مسلم مفاد کے لئے جہاد اور صلح ومعاہدہ دونوں میں سے جو ضروری ہو وہ اختیار کرنا مذہبی فرض ہے کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ وان جنحو اللسلم فاجنح لھا۔ نیز صحیح احادیث اور صلح حدیبیہ کا اسوۂ حسنہ نص کا حکم رکھتے ہیں۔" اور صلح کی تائید میں امام شافعی کی کتاب الام سے تین حوالے نقل فرماکر اپنی طرف سے گویا یہ ثابت کردیتے ہیں کہ جہاد وصلح دونوں فرض ہیں اور عنداللہ مساوی بھی۔"

(برہان۔ مارچ صفحہ ۱۷۳۔ ۷۴)

ناظرین ذرا انصاف کریں کہ اس تنقید کو میرے بیان سے کیا واسطہ ہے۔ جناب مولوی صاحب ہی از راہ کرم بتادیں کہ آپ کے اس مسئلہ میں جو نسبہ اس کا ہے اس کا مشار الیہ میری تحریر کا کونسا مسئلہ ہے آپ کی تمہید کا کوئی مسئلہ اس کا مشار الیہ ہے تو ہوا کرے۔ میرے کلام کی تنقید سے اس کو کیا واسطہ۔ مگر مولوی صاحب کو خواہ مخواہ ایک پھندا صلح ومعاہدہ کی بحث کا اپنے ادعائے خاص کے لئے ڈالنا منظور تھا۔ بلا مناسبت بھی میرے کلام کی تنقید کے نام سے لکھ مارا۔ اور پھر ترجمہ بھی آیۃ مذکور کا وہ کیا کہ ضلّ وجلّ اور اگر (غیر مسلم) صلح ومعاہدہ کے لئے جھکیں تو تم بھی اس کام کے لئے جھک جاؤ جس کا مفہوم یہ ہے کہ غیر مسلم برسرپیکار ہوں یا نہ ہوں تم سے صلح کرنے کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ[1] حالانکہ قرآن مجید میں یہ حکم خاص ہے صرف ان نامسلموں کے بارے میں جو پہلے سے آمادۂ پیکار تھے سورۂ انفال کو پڑھئے یہی بات سمجھ میں آئے گی۔ اس حکم خاص کی تعمیم بھی ہوگی تو یہی کہ جو نامسلم تمہارے اور تمہارے اللہ کے دشمن تم سے، لڑنے مرنے کو تیار ہوں اور پھر امن وآشتی کی طرف جھکیں تو تم بھی امن وآشتی پر راضی ہو جاؤ یعنی جنحوا کی ضمیر سے مطلق غیر مسلم مراد نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس تقید واطلاق سے غیر مسلم کے مفہوم میں کس قدر تفاوت ہو جاتا ہے جناب مولوی صاحب نے جنحوا کی ضمیر کے مصداق کو مطلق ٹھہرا کر اپنی طرف سے آیۃ میں یہ گنجائش پیدا کرلی ہے کہ غیر مسلم ابنائے وطن صلح چاہتے ہیں تو مسلمانوں کو ان سے صلح کرنا فرض ہے۔ ان جنحوا للسلم فاجنح لھا کا (جو حکم خدا ہے) یہی مدعا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے (رہا یہ امر کہ کیا ابنائے وطن نامسلموں کے ساتھ جب تک کہ وہ نہ لڑ رہے ہوں یا لڑنے پر آمادہ نہ

---

[1] صحیح ترجمہ یہ ہے کہ وہ (مشرکین جو آمادہ جنگ ہیں) صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ۔

ہوں صلح یا معاہدہ یا موادعۃ (امن آشتی سے رہنا سہنا) اسلام میں جائز ہی نہیں؟ یہ میرے نزدیک یقیناً جائز ہے لیکن نہ آیۃ مذکورہ بالا کے حکم سے کمالا یخفی۔

امام شافعی کی کتاب الام سے جناب مولوی صاحب نے درباب صلح تین عبارتیں نقل کی ہیں۔ اور تیسری عبارت کو استشہاد قرار دیا ہے لیکن وہ نہ دوسری عبارت (صفحہ ۱۱۰ کتاب الام) کا استشہاد ہو سکتی ہے (کیونکہ استشہاد اس سے پہلے (صفحہ ۱۰۹ کتاب الام) آیا ہے۔ اور نہ پہلی عبارت (صفحہ ۱۱۰ کتاب الام) کا کہ استشہاد سے پہلی کی عبارت (وقد کف رسول الله صلى الله عليه وسلم عن قتال كثير من اهل الارثان بلامهادنة اذنتنا طت دورهم عنهم مثل بنی تميم وربيعة واسد وطيئی حتى كانواهم الذين اسلموا) کو جناب مولوی صاحب نے صاف حذف کر دیا ہے۔ مانا کہ جناب مولوی صاحب نے کتاب الام سے جو عبارت استشہاد کے نام سے نقل کی ہے وہ استشہاد کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن وہ اپنی جگہ پر نہ استشہاد ہے نہ امام شافعی نے اس کو استشہاد کے طریق پر استعمال کیا ہے۔ جناب مولوی صاحب نے یہ تصرف بیجا اسے استشہاد ٹھہرالیا ہے، کتاب الام سے باب المہادنۃ پڑھئے۔ تصرف بیجا کا راز کھل جائے گا مگر یہ خیال رہے کہ شہادت اور مشہود علیہ میں فصل نہیں ہوا کرتا ورنہ شہادت کے اول میں کوئی لفظ ایسا لاتے ہیں کہ معلوم ہو جائے یہ شہادت ہے۔

جہاد اور مہادنۃ بھی (خواہ وہ بمعاہدہ ہو یا بلا معاہدہ) دونوں ہم مرتبہ نہیں۔ جناب مولوی صاحب نے چاہا ہے کہ فہذا فرض اللہ علی المسلمین قتال الفریقین من المشرکین وان یہادنوھم کی سند پر امام شافعی کی زبان سے جہاد اور مہادنۃ کو برابر کا فرض بنادیں تاکہ ان کا یہ مدعا حاصل ہو جائے کہ جہاد کی طاقت نہیں ہے تو مہادنۃ صلحی لازمی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسی مدعا کے لئے تو جناب مولوی صاحب نے مہادنۃ غیر صلحی کے متعلق امام شافعی کی وہ عبارت حذف فرمائی ہے جو وقف کف رسول اللہ ﷺ سے شروع ہوتی ہے اور ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

جناب مولوی صاحب کا یہ دعویٰ بھی بلا دلیل ہے کہ امام شافعی اور ابن قیم نے (برہان مارچ صفحہ ۱۷۵) عہد نامہ زیر بحث سے استناد کیا ہے۔ ان حضرات نے تو کہیں عہد نامہ یا ابن اسحٰق وابو عبید کی روایت کا نام نہیں لیا ہے یہ خود جناب مولوی صاحب کا فہم وقیاس ہے کہ وہ

اسی نامہ سے استناد فرماتے چونکہ یہاں ضرورت صراحت و دلیل کی ہے جو موجود نہیں اسی لئے وہ محل کلام ہے۔ ہمارے نزدیک وقوع عہد کی صحت اور متن عہد (عبارت معاہدہ) کی صحت بالکل دو الگ الگ چیزیں ہیں متن کی صحت کا مدار ہوتا ہے صحت روایت پر اور اس کا اسناد کی سلامتی پر اور یہاں وہی معرض بحث میں ہے۔ برخلاف اس کے وقوع عہد کی صحت کے لئے شہرت بھی کافی ہو سکتی ہے۔ امام شافعی [1] کی جو عبارت جناب مولوی صاحب نے نقل فرمائی ہے۔ اس سے وقوع عہد کی صحت ثابت ہو سکتی ہے نہ کہ زیر بحث عہد نامہ کی صحت۔ ابن قیم کی عبارت سے بھی جو جناب مولوی صاحب کے نزدیک نسبتہً قوی الدلالت علی المطلوب ہوگی، یہ مطلب پورا نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اول میں بھی قالوا آیا ہے جس کے معنی ہیں لوگوں نے یا فقہا نے کہا۔ یہی لوگ ابن قیم کا مستند ہیں نہ کہ یہ نامہ یا اس کی روایت یہ تحقیق ہے، جناب مولوی صاحب کی اس تحریر کی جو آپ نے صفحات میں پھیلا کر لکھی ہے اور اس میں امام شافعی، ابن قیم کے علاوہ ابن تیمیہ وغیرہ کے نام لئے ہیں۔

(برہان مارچ صفحہ ۱۷۴۔۱۷۵۔۱۷۶)

اب قبل اس کے ہم ان نتائج (برہان صفحہ ۷۵) تک پہنچیں جو جناب مولوی صاحب نے مذکورہ بالا اکابر امت کی تحریر سے نکالے ہیں جناب مولوی صاحب کی ایک اہم غلطی کا ذکر کر دینا مناسب مقام خیال کرتے ہیں۔

جناب مولوی صاحب نے امام شافعی کی جو دو عبارتیں (صفحہ ۱۷۴) نقل فرمائی ہیں ان میں سے دوسری عبارت میں آیا ہے اوخلة بالمسلمین او بمن الیھم منھم اس میں سے آخر الذکر فقرہ کا جناب مولوی صاحب نے قطعاً ترجمہ ہی نہیں کیا ہے۔ اس کا نگاہ سے رہ جانا ممکن ہے۔ لیکن خلة بالفتح کو جس کے معنی ہیں رخنہ، کمزوری آپ نے خلة بالضم ٹھہرایا ہے جس کے معنی ہیں دوستی حالانکہ خلة بالضم اس مقام پر سراسر خلاف قرینہ ہے اولاً وہ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا کے تحت میں ہے۔ دوسرے یہی لفظ امام شافعی کے کتاب کے باب المھادنہ میں جو یقیناً مولوی صاحب نے پڑھا ہوگا اس طرح آیا ہے کہ اس کو کوئی خلہ بالضم پڑھ ہی نہیں سکتا۔

---

[1] امام محمد رحمۃ اللہ سے جو روایت جناب مولوی صاحب نے مبسوط سے نقل فرمائی ہے اس کے مفاد سے ہمیں اتفاق ہے۔ اس لئے اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اسے ہم کسی اور جگہ لائیں گے۔

اور پڑھ بھی لے تو عبارت کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ وهى هذا وذلك ان يلتحم قوم من المسلمين فيخافون ان يصطلموا الكثر العدو وقلتهم دخلة فيهم فلا باس ان يعطوا فى تلك الحال شيئا من اموالهم مگر جناب مولوی صاحب اس تنبیہ کے بھی متنبہ نہ ہوئے اور خلة بالفتح کو خلة بالضم ٹھہرا کر ترجمہ یوں فرماتے ہیں کہ یا مسلمانوں کے ساتھ ان (مشرکین) کے تعلقات دوستانہ ہوں تو ان تمام صورتوں میں ان سے ترک جہاد جائز ہے۔ حالانکہ معنی امام شافعی کی عبارت کے یہ ہیں کہ جب مسلمان مشرکوں یا ان کی کسی جماعت کے مقابلہ میں کمزور ہوں۔ سرزمین مشرکین دور ہو۔ یا ان کا شمار بہت زیادہ ہو یا مسلمان مشرکوں کے بالمقابل کمزور ہوں یا ان سے قریب کے مسلمان (جن سے مدد کی امید ہو سکے) کمزور ہوں تو اس حالت میں جہاد و جنگ سے باز رہنا (جب تک یہ مواقع دور ہوں) جائز ہے۔ کہاں یہ معنیٰ اور کہاں جناب مولوی کا ترجمہ۔ سیاہ سفید اور زمین آسمان کا فرق ہے۔ مشرکوں کا من حیث القوم یا من حیث الجماعۃ مسلمانوں کا دوست ہونا۔ پھر ان کی دوستی کی بنا پر مسلمانوں کا ان پر جہاد نہ کرنا اور پھر یہ جہاد نہ کرنا شرعاً جائز ہو جانا۔ واقعی اسی اسلام کی باتیں ہیں جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

اب میں ان نتائج کو لیتا ہوں جو جناب مولوی صاحب نے اپنی تمہید و تقریب سے نکالے ہیں۔ (برہان صفحہ ۱۷۵)

(۱) مفادامت کو پیش نظر رکھنا واقعی امام یا قائم مقام امام کا فرض ہے اور وہ جہاد سے حاصل ہوتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد فرض ٹھہرایا۔ لیکن کبھی کبھی مجبوری بھی پیش آسکتی ہے۔ ولا يكلف الله نفساً الا وسعها اس لئے قرآن سے بفقه اور احادیث سے بصراحت مہادنۃ کی اجازت دی ہے جو کبھی بصلح ہوتا ہے اور کبھی بغیر صلح وقد كف رسول الله عن قتال كثير من اهل الاوثان، یہ ہے حقیقت شرعی لیکن جناب مولوی صاحب کا یہ فرمانا بطریق حصر صحیح نہیں کہ مفادامت مسلمہ کبھی جہاد سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی صلح و معاہدہ سے اس لئے کہ تیسری صورت اور بھی ممکن ہے جیسے کہ ہم نے ابھی بیان کی۔

(۲) صلح حدیبیہ اور معاہدہ یہود دونوں کو جناب مولوی صاحب کا قابل استناد کہنا بھی درست نہیں حدیبیہ کے کئی واقعات کا قرآن میں ذکر آیا ہے اور احادیث صحیح میں بھی، گویا صلح

حدیبیہ ایک واقعہ ہے اس کی روایتیں بھی صحیح اور اسانید بھی متصل ہیں۔ برخلاف اس کے معاہد یہود ان تمام باتوں سے محروم ہے۔

صلح حدیبیہ کی عظمت، اس کی روایت کی صحت کو دیکھئے اور پھر اس لفظی و معنوی اختلاف کو بھی جو اس کی روایات میں پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خاص عہد نامہ کے متن والفاظ میں بھی۔ اسی لئے وہ تا بحد اتفاق مسلّم ہے اور باقی نا مسلّم بعض محدثین نے تو اس کے متن کو روایت ہی نہیں کیا۔ معتبر اسناد نہ پائی ہوگی۔ ابن اسحٰق کا سلسلہ روایت گم نہیں ہوا تھا پھر اس کی روایت سب نے کیوں نہیں لی۔ اس کی کتاب کو اس بارے میں معتبر کیوں نہیں مانا۔ اسی لئے کہ اس کی اسناد کو قابل اعتماد نہیں جانا۔ معاہدہ یہود میں تو اسناد ہی منقطع ہے۔ اس کے متن میں بھی کلام کی گنجائش ہے پھر اس سے استناد کرنا اور معظمات امور میں استناد کرنا اور وہ بھی محض الفاظ کے سہارے پر بھلا یہ کہاں تک حجت وسند ہو سکتا ہے جب کہ یہ مسلّم ہے کہ احادیث کی روایت اکثریۃ بالمعنیٰ ہے خصوصاً احادیث طوال کی بعض عہد ناموں کی بابت راویوں نے لکھا ہے کہ یہ عہد نامہ ہم نے بچشم خود دیکھا۔ اس کے لئے یہ بھی کوئی نہیں کہتا۔

لیجئے جناب مولوی صاحب کے مضمون کی تقریب بھی یہاں ختم ہوئی اب وہ نتیجہ آتا ہے جس کو معقول ومدلل ثابت کرنے کے لئے یہ مقدمات لائے گئے تھے۔ ورنہ میرے مضمون کو ہدنہ و صلح سے کیا واسطہ تھا۔ میں نے اس سے کب انکار کیا تھا۔ اور کس جگہ ان سے بحث کی تھی کہ ان کی تنقید میں ان باتوں کی ضرورت ہوئی۔ اب ناظرین دیکھ لیں گے کہ یہ صلح و معاہدہ کی باتیں جناب مولوی صاحب کیوں درمیان میں لائے۔ سنئے اور ہمہ تن گوش وہوش ہو کر سنئے جناب مولوی صاحب فرماتے ہیں۔

”زیر بحث متحدہ قومیت بھی معاہدہ کی ایک قسم ہے۔“

ناظرین آپ نے دیکھ لیا کہ میرے مضمون کی تنقید اول میں بلاضرورت تنقید معاہدہ کی بحث...... کیوں لائی گئی تھی۔

اچھا جناب مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ زیر بحث متحدہ قومیت معاہدہ کی ایک قسم ہے کوئی اسے مانے نہ مانے مجھے اس سے کیا۔ لیکن جناب مولوی صاحب مجھے اتنا بتادیں کہ یہ زیر بحث متحدہ قومیت کوئی قدیم چیز ہے یانو تجویز اگر قدیم ہے اور معاہدہ کی ایک قسم ہے تو فرمایئے

کہ اس متحدہ قومیت کا کون کون سی اکابر امت کی کتابوں میں مذکور ہے کس کس نے اس کو معاہدہ کی قسم مانا ہے اور اگر یہ آپ کی ایک جماعت کی بنائی ہوئی چیز ہے تو پھر اکابر امت کی کتابوں میں ہدنہ ومعاہدہ کے ابواب چھاننے اور ان سے حوالہ دینے سے فائدہ؟ پہلے متحدہ قومیت کو معاہدہ کا مترادف ومتواطی تو ثابت کیا ہوتا۔ کسی محارب یا غیر محارب قوم سے صلح کرنا چیزے دیگر ہے اور ان سے مل کر یا ان کو ملا کر متحدہ قوم اور قومیت بنانا چیزے دیگر۔ ایک احکام کا دوسرے پر صادق آنا آخر کیسے معقول ہوگیا۔ اور ہو سکتا ہے اور اگر فرمائیں کہ ہماری اور ہماری جماعت کی مراد متحدہ قومیت سے محارب یا غیر محارب قوم سے باہمی مصالحت اور معاہدات ہی ہے تو عرف اظہر واشہر کو چھوڑ کر اس ایجاد کی ضرورت کیا پیش آئی اور اول ہی احکام مصالحت معاہدت ان کتابوں سے کیوں پیش نہیں کئے گئے جو اب عند البحث پیش کئے جارہے ہیں نیز مصالحت ومعاہدت کے مقابلہ میں متحدہ قومیت پر کیوں زور دیا جارہا ہے جبکہ وہ دونوں ایک ہیں۔

اب میں پھر اصل بحث کی طرف آتا ہوں جس کو سیاق چاہتا ہے۔

چونکہ قومیت کا لفظ اب درمیان میں آگیا ہے ذرا اس لفظ اور اس کے معنی ومفہوم کو بھی دیکھ لینا چاہئے کہا جاتا ہے کہ قوم کا لفظ عربی ہے اس کے معنی بھی لغات عربی سے متعین ہونے چاہئیں اور وہ بھی وہی ہوں جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں یا زمانہ قرآن وحدیث میں مستعمل رہے ہیں۔ آج کل کے عرف کی ہی نہیں کہ یہ عرف بعد کی پیداوار ہے۔ بات معقول وناقابل انکار ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عرف وقت کا کیا ہے۔ عرف اس زمانہ میں قوم کا ایک عملی اور تنگ ہے جسے لفظی تعریف کی حیثیت سے برادری کہتے ہیں دوسرا علمی اور وسیع ہے۔ جس کا مصداق اس مجموعہ کو سمجھا جاتا ہے جس کا ایک نسب ہو، ایک زبان ہو، ایک وطن ہو، ایک مذہب ہو، ملتی جلتی معاشرت ہو، ان اوصاف میں جس قدر کسی جماعت میں کمی ہوگی اسی قدر اس کی قومیت کا رابطہ کمزور ہوتا جائے گا۔ خواہ قوم از قسم اول ہو یا از قسم ثانی۔ متحدہ قومیت بنانے کے حامی کہتے ہیں کہ ہماری مراد قومیت سے یورپ کی ایجاد کردہ متحدہ قومیت نہیں ہے مگر وہ خود یہ نہیں بتاتے کہ یورپ کی ایجاد کردہ قومیت یا متحدہ قومیت کا مفہوم ان کے نزدیک کیا ہے۔ اگر ان کی نگاہ میں قومیت کی علمی تعریف جو ابھی ہم نے بیان کی ہے یورپ کی ایجاد کردہ تعریف ہے۔ اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تعریف انگریزوں اور ان کی حکومت یا اس کے پروپیگنڈہ سے ہمارے ملک

میں پیدا ہوئی ہے تو میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ خود قرآن مجید میں اس قسم کے انسانی مجموعہ پر قوم کا اطلاق ہوا ہے۔ ولقد فتنا قبلهم قوم فرعون وجاء هم رسول كريم قوم فرعون ایک نسب کی طرف منسوب تھی ایک ملک میں رہتی تھی۔ ایک زبان بولتی تھی، ایک مذہب رکھتی تھی، ایک ہی اس کی معاشرت بھی ہوگی، قوم فرعون کی ان صفات سے انکار کرنا یا قوم نوح کو ان اوصاف سے متصف نہ ماننا سراسر مکابرہ ہے ہزار برس ہوئے خلیفہ متوکل عباسی مرا تو یزید المہلبی نے اس کے مرثیہ میں ایک قصیدہ کہا۔ اس میں یہ دو شعر بھی ہے۔

قوم هم الخدم والانساب تجمعهم والمجد والدين والاحسام والبلد

اذا قـريش ارادرشـد ملكـهم بغيـر فحطـان لم يرح به اوُد

قحطان عرب کی ایک قوم کا نام ہے اسے ہمارے یہاں کی اسی عصری علمی اصطلاح کے موافق قوم کہا گیا ہے صرف ایک صفت ہم زبانی مذکور نہیں ہے۔ مگر زبان قحطان کی ظاہر ہے کہ ایک تھی۔ شاعر قوم کی حقیقت بیان کرنے نہیں بیٹھا تھا کہ بات بات کا خیال رکھتا۔ تاہم وہ باتیں کہہ گیا ہے جن سے زمانہ ہزار برس میں بھی کچھ آگے نہیں سرک سکا۔

اچھا صاحب آپ نے دیکھا کہ ہم نے قوم کے موجودہ معنی (جس کو یورپ کی ایجاد اور انگریزوں کا پڑھایا ہوا سبق بتایا جاتا ہے) قرآن اور ہزار سالہ اشعار عرب سے پیش کر دیئے۔ اب ہم جناب مولوی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات سے دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ آپ حضرات اپنے خیال میں جب متحدہ قوم بنانے بیٹھے تو رسول اللہ کے زمانہ کی سی قوم بنانے بیٹھے (جس کی تعریف بھی بہ مصلحت ابھی تک مبہم اور گول ہی رکھی گئی ہے) اور قوم کے وہی معنی بھی رکھے جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں، یا اس زمانہ کے لوگ باہم بول چال میں استعمال کرتے تھے اب آپ کے ہاں قومیت کے معنی بھی اسی زمانہ کی بول چال کے موافق ہوں گے اور ہونے چاہئے۔ اس لئے آپ کو بھی (اس زمانہ کی سی قوم بناتے وقت ماہیت جیسے لد، فلسفیانہ جعلی الفاظ استعمال کرنے اور ان کے محدث معنی مراد لینے کا کوئی حق انصافاً نہیں ہے۔ اس لئے اب مجھے جناب مولوی صاحب اور ان کے ہم خیال کہیں دکھادیں (قرآن وحدیث کا تو ذکر کیا ہے) کہ عربی زبان اور عربی لغت میں کہیں قومیت کا لفظ ان معنی میں آیا ہے جس میں وہ استعمال کررہے ہیں اور لفظ متحدہ قومیت سے عوام وخواص اور متوسط درجہ کے پڑھے لکھے لوگ سمجھتے ہیں۔ عربی میں تو

قومیت کے معنی ہیں جسم کا خوبصورت گھات (سڈول پن) خاص کر اس عہد کی زبان میں جس کی رو سے عربی الفاظ کے معنی متعین کئے جانے پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں تو قومیت یا متحدہ قومیت کو معاہدہ ہی کے معنی میں دکھادیں۔

اب میں اختصار در اختصار کی طرف آتا ہوں اور ناظرین آئیں ان مسائل کی طرف جو میرے اور جناب مولوی صاحب کے درمیان زیر بحث چلے آتے ہیں۔

(برہان مارچ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸) سیرت کی روایت فی حد ذاتہا تو سیرت ہی کی روایت کہلائے گی۔ تاہم میں نے زیر بحث روایت کو فقط سیرت کی روایت کہاں کہا ہے میں نے بلا فصل اس کے ساتھ ہی ابو عبید کی روایت لکھی ہے پھر فقط سیرت کی روایت کیونکر کہہ سکتا تھا ہاں ابو عبید کی روایت کی تنقید ضرور کی اور لکھا کہ اسناد اس کی بھی منقطع ہے روایت کو بھی نہ منقطع کہا نہ مرسل کہ اس کے متن کے بارے میں بھی مجھے کلام تھا کتاب الاموال بیشک احکام کی کتاب ہے۔ حدیث کی تو نہیں اور کیا حدیث کی بھی سب کتابیں اور ہر کتاب کی سب حدیثیں آنکھیں بند کر کے مان لینے کے قابل ہیں۔ کتاب الاموال احکام کی کتاب ہے اس لئے تو حدیث کے باب میں زیادہ معتبر نہیں۔ کتاب الاحکام میں کسی حدیث کے آجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ضرور قابل اعتبار واحتجاج ہے۔ زیر بحث روایت سے ابو عبید نے بھی احکام کا استخراج نہیں کیا ہے۔ روایت میں ابو عبید نے کلام بھی لغویانہ کیا ہے نہ محدثانہ، اپنی روایت کی آپ ہی توثیق کرنا بھی قابل اعتنا نہیں ہو سکتا۔ جناب مولوی زیر بحث روایت کو زہری کی مراسیل میں مان کر تیسرے درجہ کی مرسل روایت فرماتے ہیں۔ اس ضعف بر ضعف کے ساتھ ساتھ ابراهیم الحربی کی رائے کا اس پر اور اضافہ فرمالیں۔

"كان ابوعبيد...... يحين كل شئى الا الحديث...... واضعف كتبه كتاب الاموال. يجئى الى باب فيه ثلاثون حديثا اوخمسون اصلاً عن النبى صلى الله عليه وسلم فيجيئى بخديث حديثين بجمعهما من حديث الشام ويتكلم فى الفاظهما.

اور روایت زیر بحث میں اوخال الروایۃ فی الروایۃ ایک حد تک ظاہر ہے یہ بات بھی محدثین کے نزدیک رد حدیث کا ایک سبب ہوتی ہے۔

تبصرۂ کتاب

تبصرہ نگار: محمود سعید بلالی

نام کتاب: حیات اختر

مصنف: شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری دامت برکاتہم
خلیفۂ اجل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نور اللہ مرقدہ

صفحات: ۱۳۶ قیمت: چالیس روپے، کتابت طباعت عمدہ خوشنما اور جاذب نظر

ملنے کا پتہ: جامعہ عربیہ نورالاسلام، شاہ پیر گیٹ، میرٹھ شہر (یوپی)

زیر تبصرہ کتاب ایک لائق و ہونہار، سعادتمند، علم و ہنر کی دولتِ بے بہا سے مالا مال خوش نصیب، عالم فاضل شاگرد کا اپنے قابلِ تعظیم علم و فضل کی بلندیوں پر پہونچے ہوئے استاد کی پاک اور صاف ستھری زندگی کی عکاسی کتابی صورت میں نذرانۂ عقیدت ہے۔ جس کا تعارف کتاب کے سرورق پر اس طرح درج ہے: "فلک علم کے اختر تاباں، تلمیذِ شیخ الہندؒ، علامہ وقت ماہر علوم و فنون، امام الاتقیاء استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد اختر شاہ خانصاحب امروہویؒ کے حالات اور نمونۂ کلام۔"

آج کے پُر فتن ماحول میں فلک نما عمارتوں میں قائم بڑی بڑی دیدہ زیب یونیورسٹیوں کالجوں اور اسکولوں میں میز کرسیوں پر شاہانہ انداز و طریقے سے تعلیم حاصل کرنے والے، شاگردوں کے ہاتھوں اُستادوں کی پٹائی کی خبریں سننے اور پڑھنے کو ملتی ہیں تو پھٹی پرانی دریوں و چٹائیوں پر بیٹھے ہر دم استاد کی خدمت میں باادب کھڑے ہونے والے فرمانبردار شاگردوں کی اعلیٰ ظرفی کی داستانیں ماڈرن دنیا کی بے چین زندگی میں سکون و اطمینان کا مژدہ ہے۔ کتاب "حیات اختر" شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری صاحب دامت برکاتہم کے قلم سے اپنے استادِ معظم حضرت مولانا اختر شاہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات

کی اجمالی روداد زبان و بیان کی شیرینی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری صاحب دامت برکاتہم جواب جواں سالی سے پیرانہ سالی میں ہیں اور جن کے سیکڑوں ہزاروں شاگرد ہیں اور جو خود زبردست عالم فاضل اور نیک بزرگ ہیں نے اپنے استاد کی خدمت کا حق ہی جیسے ادا کردیا ہے اس کتاب کو شائع کر کے اپنے استاد مکرم کے علم و فکر کے ذکر کے ساتھ ولادت باکرامت کا حال اس قدر دلچسپ انداز میں سپرد قلم کیا ہے جسے یہاں نقل کئے بغیر رہوار قلم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"آپ کا نام محمد اختر شاہ خاں والد ماجد کا نام حبیب شاہ خاں ہے۔ آپ کا تعلق قوم افغان سے ہے۔ آپ تقریباً ۱۲۹۰ھ مقام امروہہ ضلع مراد آباد صوبہ یوپی میں پیدا ہوئے آپ کی ولادت سے ایک فقیر کی کرامت وابستہ ہے جس کو آپ خود سنایا کرتے تھے۔ میرے والد ماجد حبیب شاہ خاں صاحب بسلسلۂ ملازمت دھولپور میں مقیم تھے اور داروغہ کے عہدے پر فائز تھے شادی کو عرصۂ طویل گزر گیا تھا اور کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی ایک روز کوتوالی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک فقیر آیا اور اس نے کہا داروغہ جی میں بھوکا ہوں مجھے کھانا کھلائیے آپ نے فوراً بازار سے کھانا منگوا کر درویش کو پیش کیا اس نے کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور داروغہ جی کو دعا دی۔ خدا کرے آپ کے بیٹے پوتے جیتے رہیں داروغہ جی نے اس سے کہا بیٹے پوتے کیا، یہاں تو کسی بچہ کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ درویش نے کہا اچھا داروغہ جی، اللہ تعالیٰ آپ کو ایک بیٹا دے گا اور وہ ایک ہزار کے برابر ہوگا۔ چنانچہ اس فقیر کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور اس کے دس ماہ بعد حضرت مولانا کا تولد ہوا اور بعد میں بقول درویش ہزاروں پر فائق ہوئے۔"

پوری کتاب اپنی قسم ہا قسم کی دلچسپیوں کے سامان کے ساتھ بھری بلکہ لدی ہوئی ہے۔ حضرت کی شعر و شاعری، نعتیہ کلام، نظم، فضائل رمضان، فضائل درود، اشعار ترغیب نماز اشعار تنبیہ مسلم، مناجات رباعیات، قصیدہ عربی بر وفات حضرت شیخ الہندؒ پڑھتے رہئے اور جھومتے رہئے۔ "محمد اسلام لانے والوں کے حشر کے دن شفیع ہوں گے۔" بے پسندیدہ اللہ ذ محمد اسلام "اپنے لائق و سعادت مند شاگرد حکیم مولانا محمد اسلام صاحب دامت برکاتہم کے لئے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد اختر شاہ خاںؒ کا دعائیہ عکس تحریر بھی سمجھنے اور احترام

وسلیقے کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ حضرت استاذ الاساتذہ مرحوم کے دیگر عکس تحریر جو مختلف موضوعات پر مثلاً تاءبیات سماعی، فن عروض، علم فقہ علم فرائض کے اسباق اور نمونۂ تقاریر اور ساتھ ہی حضرت مولانا محمد سالم صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب دامت برکاتہم فقیہہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب ناظم اعلیٰ مدرسہ مظاہر علوم وقف سہارنپور محدث کبیر حضرت مولانا محمد انظر شاہ مسعودی کشمیری دامت برکاتہم صدر المدرسین دارالعلوم وقف دیوبند کی کتاب حیات اختر سے متعلق گرانقدر تحریریں بھی پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ کتاب میں بوریت کہیں بھی نہیں آنے پائی ہے۔ کتاب کو پڑھنا شروع کردیا جائے تو چھوڑنے کو طبیعت کسی بھی صورت میں پوری کتاب پڑھے بغیر آمادہ نہ ہوگی۔ موضوع آئینہ زندگی ایک بیتی ویسے قاری کی دلچسپی کا سامان لئے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ کتاب تو ایک مشاق اہل قلم شاگرد کی اپنے استاذ الاساتذہ کی حیات پر تصنیف ہے جسے ہر لحاظ سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہونا ہی تھا۔ اچھی زندگی جینے، اپنی اولاد کی صحیح تربیت کرنے کے خواہش منداور دین سے شغف رکھنے اور ملت کا فلاح وبہبود چاہنے اور اچھی کتابوں کا ذوق وشوق رکھنے والوں کے لئے کتاب حیات اختر مصنفہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری صاحب دامت برکاتہم ایک تحفہ ہے اور اردو زبان کے دینی ذخیرہ میں ایک قابل قدر کتاب کا اور اضافہ بھی ہے۔

(محمود سعید بلالی)

R.N.I. REGN NO. 965/57 Price Single Copy .Rs 10/= May June 2000

BURHAN (Monthly)

Edited by. Amidur Rehman Usmani

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid Delhi-110006 : 3262815-3241136

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

ہماری مطبوعات

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
ابو بکر صدیق کے سرکاری خطوط	125	تاریخ ملت جلد ششم خلافت عباسیہ دوم	90
العلم والعلماء	125	تاریخ ملت جلد ہفتم تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ	60
اسلام میں غلامی کی حقیقت	125	تاریخ ملت جلد ہشتم خلافت عثمانیہ	60
اخلاق اور فلسفہ اخلاق	125	تاریخ ملت جلد نہم تاریخ صقلیہ	55
اسلام کا نظام عفت و عصمت	75	تاریخ ملت جلد دہم سلاطین ہند حصہ اول	65
آثار و اخبار جلد اول	100	تاریخ ملت جلد یازدہم سلاطین ہند حصہ دوم	65
الانور	100	ترجمان السنہ (چار جلدیں)	1200
امام غزالی کا فلسفہ مذہب و اخلاق	100	ترجمان السنہ جلد اول	300
انتخاب الترغیب والترہیب (کامل)	600	ترجمان السنہ جلد دوم	300
انتخاب الترغیب والترہیب (جلد اول)	150	ترجمان السنہ جلد سوم	300
انتخاب الترغیب والترہیب (جلد دوم)	150	ترجمان السنہ جلد چہارم	300
انتخاب الترغیب والترہیب (جلد سوم)	150	حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ	125
انتخاب الترغیب والترہیب (جلد چہارم)	150	حضرت عثمان کے سرکاری خطوط	125
الفوز الکبیر اردو	75	حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی	150
ایشیا میں آخری نوآبادیات	50	حیات سلیمان	150
تاریخی مقالات	125	حجاز و ماوراء حجاز جلد اول (زیر طبع)	0
تاریخ مشائخ چشت	250	حجاز و ماوراء حجاز جلد دوم	50
تاریخ گجرات	175	حضرت عثمان ذوالنورین	150
تاریخ ادبیات ایران	300	حیات ذاکر حسین	60
تاریخ ہند پر نئی روشنی	75	خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام	50
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	125	خلافت راشدہ کا اقتصادی جائزہ	50
تاریخ ملت کامل گیارہ جلدیں	760	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد اول	150
تاریخ ملت جلد اول نبی عربی	60	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد دوم	150
تاریخ ملت جلد دوم خلافت راشدہ	90	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد سوم	150
تاریخ ملت جلد سوم خلافت بنی امیہ	90	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد چہارم	150
تاریخ ملت جلد چہارم خلافت ہسپانیہ	50	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد پنجم	150
تاریخ ملت جلد پنجم خلافت عباسیہ اول	75	جائزے (تاریخی، تمدنی، ادبی) جلد ششم	150

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد: ۱۲۷

شمارہ: ۲،۱

جولائی، اگست

بُرہان

اس

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

منیجر ماہنامہ برہان

4136-اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006

فون نمبر: 3262815 -3241136

زرِ تعاون

فی پرچہ: ۱۰ روپے

سالانہ: ۱۲۰ روپے

رحمٰن کمپیوٹرس دہلی

Ph: 6952082

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

کل تک جس پارٹی کی پہچان ہی مسلم دشمن پارٹی کی حیثیت سے تھی آج وہی پارٹی سب سے بڑھ کر اپنے کو مسلمانوں کا دوست، مسلمانوں کا ہمدرد، مسلمانوں کا سچا بہی خواہ اور مسلمانوں کا ہندوستان میں مضبوط محافظ ہونیکا دعویٰ کر رہی ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے ہی ہندوستان میں رام مندر کے لیے رتھ یاترا نکالی تھی اور بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی مندر بنانے کا زور و شور سے اعلان کیا تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء میں "کار سیوا" کے ذریعہ جسطرح بابری مسجد کا انہدام کیا گیا وہ نہ صرف ہندوستان کی تاریخ میں انتہائی بدنما داغ ہے بلکہ پوری انسانیت کیلیے بڑے ہی شرم و تاسف کی بات ہے۔ "کار سیوا" تو بھارتیہ جنتا پارٹی نے بڑے زور و شور سے کرائی لیکن جب بابری مسجد شہید ہو گئی تو اس کے جواب میں پوری دنیا میں جو رد عمل ہوا اس کے بعد جو لوگ مسجد کے انہدام کو عظیم کارنامہ قرار دے رہے تھے وہ ایکدم خاموش ہو گئے۔ ہندوستان کی اکثریت نے بھی مسجد کے انہدام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ ہندوستان کے عوام کی اکثریت تو مسجد کی شہادت پر ہکا بکا رہ گئی اور اس نے کسی بھی نظریے سے بابری مسجد کے ڈھانے کو صحیح نہیں ٹھہرایا۔

بابری مسجد کی شہادت سے پہلے کٹر قسم کے فرقہ پرست عناصر بابری مسجد کو گرا کر اسکی جگہ مندر بنانے کا زور و شور ڈھنڈھورہ پیٹا کرتے تھے اور مسجد کو گرانیکا کریڈٹ بھی وصول کرنیکا اعلان کرتے تھے۔ حالانکہ یہ سب باتیں اور اعلانات غیر قانونی تھے، رتھ یاترا بھی غیر قانونی تھی مگر رتھ یاترا تو ایسی حکومت کے دور میں چلائی گئی جو مسلمانوں کی خیر خواہ ہونیکی دعویدار تھی اور جو ایک طرح سے مسلم ووٹوں ہی کے تعاون سے برسر اقتدار آئی تھی اور جس کے وزیر اعظم جناب وی پی سنگھ تھے اور یہ وی پی سنگھ وہی تھے جو ایک مرتبہ یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے اور وزارت اعلیٰ کے دور میں مراد آباد میں عین نماز عید کے موقع پر غریب مسلمانوں پر وہ قیامت بتی تھی کہ درندوں کی تاریخ بھی اس کے آگے مات ہو گئی تھی۔ وہی وی پی سنگھ کانگریس سے نکل کر مسلمانوں کے ہمدرد ہونے کے نقاب کو اوڑھ کر جب نئی شکل میں آئے تو مسلمانوں کی سادگی

اور سادہ لوحی پر ترس آتا ہے کہ انہوں نے بی پی سنگھ کو اپنے سروں پر بٹھادیا۔ اور ہندوستان کی وزارت عظمیٰ کے تاج کو انکے سر پر رکھ دیا۔ ہندوستان میں فرقہ پرستی کا پودا آہستہ آہستہ پھلتا پھولتا رہا۔ اور بالکل خاموشی کے ساتھ سیکولر طاقتوں کو ہندوستان میں کمزور کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ دس سال میں یہ منصوبہ کسی قدر کامیابی سے ہمکنار ہو کر رہا اور ہندوستان پر کانگریس کا دبدبہ ختم ہو گیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے تعاون سے ہندوستان پر حکومت قائم ہوئی اور پھر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مکمل طور پر ہندوستان کو بھارتیہ جنتا پارٹی کی صورت میں حکومت دیکھنی نصیب ہوئی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت بنانے میں خود کانگریس کا بھی ایک طرح سے تعاون رہا ہے وہ اس طرح کہ جب رام جنم بھومی کی تحریک چلائی گئی تو کانگریس کی حکومت تھی کانگریس نے اس تحریک کو کھلی چھوٹ دی ہوئی تھی کہ وہ جس طرح چاہے ہندوستان کے کونے کونے میں اس تحریک کو پروان چڑھائے۔ کانگریس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ایک شرمناک ہار کے بعد ۱۹۸۰ء میں دوبارہ برسر اقتدار میں آئی تھی۔ آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے دل ودماغ پر یہ بات ذہن نشین ہو گئی تھی کہ ان کا دوبارہ اقتدار میں آنا ہندوستان کے اکثریت فرقہ کا مرہون منت ہے اس لیے انہوں نے سمجھداری یا دور اندیشی سے کام لینے کی بجائے فرقہ پرستوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ جو مرضی آئے کریں۔ اندرا گاندھی کی حکومت ان کی راہ میں روڑہ نہیں اٹکائے گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ووٹ بینک بنانے کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کیا جس سے ہندوستان کے اکثریتی فرقہ کی ہمدردیاں انہیں حاصل ہوں۔ امرتسر گولڈن ٹمپل پر بلیو اپریشن ہمارے خیال سے اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اندرا گاندھی کی موت کے بعد ان کے صاحبزادے راجیو گاندھی نے بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا اور ان کے وزارت عظمیٰ کے دور میں رام مندر کا شیلا نیاس رکھا گیا۔ یہ شیلا نیاس دراصل ہندوستان سے کانگریس کے خاتمہ اور ہندوستان پر غیر کانگریسی حکومت کی بنیاد تھی۔ کچھ عرصہ بعد ہندوستان میں جنرل الیکشن میں کانگریس کا خاتمہ ہوا۔ اور کانگریس کے خلاف حکومت قائم ہوئی جس کے پہلے وزیر اعظم وی پی سنگھ تھے۔ یہ کون تھے ان کے بارے میں سب کچھ واقعات وحالات موجود ہیں جن کو یاد کر کے انہیں بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

ماضی کے دلخراش واقعات یاد کرتے کرتے ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ چھوڑیئے ابھی ان

باتوں کو یہ تاریخ کے حوالے ہیں اور تاریخ ہی ان کے بارے میں اب کوئی فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ یہاں ہمیں بھارتیہ جنتا پارٹی کے نو منتخب صدر جناب بنگارو لکشمن کے اس بیان پر غور کرنا ہے جو انہوں نے بی جے پی کا صدر منتخب ہونے پر اپنی پہلی کانفرنس میں مسلمانوں سے متعلق فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے "بی جے پی ہندوؤں کی پارٹی ہرگز نہیں ہے وہ قومی پارٹی ہے اور تمام فرقوں، مذاہب کے لوگوں اور دلتوں کی نمائندہ پارٹی ہے اس پر ہندو پارٹی کا لیبل لگانا غلط ہے وہ رائٹ لفٹ پارٹی بھی نہیں ہے۔ آج کے زمانے میں رائٹ اور لفٹ کا کوئی معنی ہی نہیں ہے۔ کیونکہ روس کے ساتھ کمیونزم کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ہندوازم ایک طرز زندگی ہے ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی بھی بی جے پی کو ہندو پارٹی کہے۔ اسی کے ساتھ بی جے پی کے صدر جناب بنگارو لکشمن نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بی جے پی میں شمولیت کی دعوت دی ہے اور کہا کہ مسلمان بھائی ہمارے خون اور گوشت کا حصہ ہیں ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ بھارتیہ جنتا پارٹی میں شریک ہوں۔ بی جے پی ان کی دوست ہے ان کے مسائل حل کرے گی، ان کے ساتھ انصاف کرے گی۔ اور ان کو آئین میں ملے تمام حقوق کی پاسبانی کرے گی۔ اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی ناانصافی نہیں ہوئی ان کو کوئی بھی زک نہیں اٹھانی پڑی ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی دل سے ہندوستانی مسلمانوں کا بھلا چاہتی ہے اس کی ہمدرد ہے، اس کی دوست ہے۔

ادھر کانگریس اور غیر کانگریس کے لیڈران نے جس طرح بیان دیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو کانگریس اور نام نہاد سیکولر پارٹیوں کے لیڈران نے اپنا بے دام غلام سمجھ رکھا ہے۔ جبکہ جمہوریت میں ہر جماعت کو یہ حق ہے کہ وہ ہر فرقہ کے لوگوں کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ شامل کرے۔ اس سلسلے میں جناب سید حامد نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ مسلمانوں کو بی جے پی کو بھی آزمانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کرنی چاہئے۔

لیکن جن لوگوں نے اپنا ذہن صرف ایک ہی طرف مرکوز کر رکھا ہے ان کے لیے ایک سلجھے ہوئے مسلم دانشور جناب سید حامد کا یہ بیان انتہائی افسوسناک ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کے یہ لیڈر مسلمانوں کو کس راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بیان سید شہاب الدین کا بھی قابل غور ہے انہوں نے بی جے پی کو ہندو پارٹی کہہ کر مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن وہ خود کس پارٹی میں ہیں یہ کسی کو بھی آج تک معلوم نہ ہو سکا۔

ان کی انصاف پارٹی کا کیا ہوا اور وہ کیا چاہتی ہے، اس کا بھی کسی کو علم نہیں ہے۔ لیکن بی جے پی کے سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ بیان اس کے کل تک ایک خاص لیکن آج سب سے بڑے دشمن یوپی کے سابق وزیراعلیٰ جناب کلیان سنگھ کا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

"ایودھیا میں بابری مسجد ڈھانے کے لیے بھارتیہ جنتاپارٹی نے انہیں استعمال کیا تھا جبکہ وہ بابری مسجد گرانے کے حامی نہیں تھے۔ بابری مسجد کے گرانے کے معاملے میں ان کی حالت اینٹ کی طرح تھی جسے بھیڑ پر پھینکا جاتا ہے اس لیے مجرم اینٹ نہیں بلکہ اسے پھینکنے والا ہے۔ کلیان سنگھ جی نے یہ بھی کہا، راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ سے بی جے پی کا جب تک تعلق رہے گا تب تک اس میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ سنگھ میں مسلم مخالف وچار دھارا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بی جے پی کے کسی بھی نیتا میں سنگھ سے تعلق توڑنے کی ہمت نہیں ہے۔"

بھارتیہ جنتاپارٹی میں اس کے صدر کی طرف سے مسلمانوں کو شمولیت کی دعوت کے حق میں اور اس کی مخالفت میں یہ سب بیانات کی موجودگی میں ہمارا مشورہ ہے کہ اگر کوئی پارٹی اپنی نئی امیج کے ساتھ میدان میں آرہی ہے اور وہ مسلمانوں کو اپنے یہاں شامل ہونے کی دعوت دیتی ہے تو اس پر ہمیں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے۔ آخر کل تک کلیان سنگھ بھی تو یہ کہتے تھے کہ آر ایس ایس کے جھنڈے میں میری لاش لپیٹ کر ہی میرا انتم سنسکار کیا جائے آج وہ آر ایس ایس کے اس قدر مخالف ہیں جب وہ بدل سکتے ہیں اور آج وہ آر ایس ایس بی جے پی کے سخت مخالفین میں ہیں تو ہم کیوں نہ اس بات پر یقین نہ کریں کہ بھارتیہ جنتاپارٹی بھی اب پہلے کی طرح مسلم مخالف نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے قابل احترام صدر جناب بنگارو لکشمن نے مسلمانوں کو بھارتیہ جنتاپارٹی میں شریک ہونے کے لیے کہا ہے۔ اس پر ہندوستانی مسلمانوں کو سنجیدگی ومتانت سے غور کرنا چاہئے۔ کل تک ان کے خیال میں وہ ایک فرقہ پرست اور مسلم مخالف جماعت تھی لیکن آج وہ خود کہہ رہی ہے کہ بھارتیہ جنتاپارٹی فرقہ پرست پارٹی نہیں ہے بلکہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے میں شامل کرنا چاہتی ہے تو ہمیں اس کا ہر لحاظ سے خیر مقدم کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں نے کسی ایک پارٹی یا جماعت کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ نہیں کر رکھی ہے۔

☆☆

(ساتویں قسط)

فنّ تاریخ گوئی کی ابتداء

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں ڈہل ایم ،اے ،اے ،بی ،ایچ ،ڈی (لیکچرر)

۴۔ حرفِ مشدد

اس میں حرف کی تکرار ہوتی ہے یعنی حرف اول ساکن اور دوسرا حرف متحرک پڑھا جاتا ہے جیسے "جنت" "کانون۔ لیکن یہ تلفظ ہوا نہ کہ کتابت۔ اس لیے حرفِ مشدد تو صرف ایک ہی دفعہ شمار ہوگا۔ لیکن ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں جن میں حرفِ مشدد کو مکرر شمار کیا گیا ہے مثلاً وزیر باتدبیر امیر علی شیر نوائی (م ۹۰۶ھ ۱۵۰۰ء) نے مولانا جامیؒ کی وفات کے مادۂ تاریخ میں لفظ "سِرّ" (س ر ر) کی رائے مشددہ کو دو دفعہ محسوب کیا ہے۔ علاوہ ازیں "الہٰ" کے کھڑے زبر کو بھی حساب میں لیتے ہوئے سال مطلوبہ برآمد کیا ہے:

کاشفِ سرّ الٰہی بود بیشک زاں سبب گفت تاریخ وفاتش "کاشفِ سرّ الٰہ"[۱] ۸۹۸ھ

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار "حساب جمل" کی رائے ہے کہ: "حرفِ مشددہ کا ایک عدد بھی لیا جاسکتا ہے اور دو بھی، اسی طرح کھڑے الف اور الف ممدودہ کو بھی حسبِ ضرورت شمار کیا جاسکتا ہے اور نہیں بھی۔"

"The doubled (Mushaddadon)letters may be counted os one or as two .similarly the initial and terminal alifs may be added in orignored as necessary." [۲]

مولانا میر نذر علی درد کاکوروی کی بھی بعینہ یہی رائے ہے: "مشدد حرف تاریخ میں کہیں مکرر لیا گیا ہے اور کہیں نہیں لیا گیا ہے۔ دونوں مثالیں ہمارے لیے سند ہیں۔ لہٰذا حسب موقع بہ نظر سہولت تاریخ میں ویسے ہی عدد لیے جائیں اور دونوں نظیروں سے فائدہ اٹھایا

۱۔ مثنوی یوسف زلیخا از مولانا عبدالرحمن جامیؒ، ص: ۲۰۳ مطبع نولکشور لکھنؤ محرم ۱۲۸۲

۲۔ Encyclopaedia of Islam -hisab Al Djumal

جائے۔" درد صاحب نے اس ضمن میں قدر بلگرامی کے حسب ذیل مادۂ تاریخ کو سند اً پیش کیا ہے:

"للہ الحمد مبارک تمہیں ساجد شادی" ۱۲۹۹ھ

اور پھر لکھا ہے کہ: "دور کیوں جایئے بسم اللہ میں لفظ اللہ کے لام کے ساتھ (۶۰) عدد لیے گئے ہیں اور اس کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ ایک عالم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ۷۸۶ عدد تسلیم کرتا ہے اور ۷۸۶ عدد اسی وقت ہو سکتے ہیں جب لام کے مکرر عدد لیے جائیں۔ مشدد حرف کے مکرر عدد لینے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔" [۱]

لیکن فی الحقیقت "اللہ" کے لام میں مولانائے موصوف کو اشتباہ ہوا ور نہ اللہ میں دو لام ہیں:

اللہ بود یک الف دہا و دو لام (اتادۂ تاریخ ص: ۲۶)

جیسا کہ صاحبِ غیاث کی تحقیق ذیل سے واضح ہوگا کہ: (ترجمہ فارسی عبارت) سیبویہ [۲] (sibawaih) کے نزدیک دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس (یعنی لفظ اللہ) کی اصل "الالہ" تھی۔ ہمزہ (یعنی ا) کو لیس [۳] کے قاعدے سے حذف کر دیا گیا اور پہلے لام کو (جو الا میں ہے) ساکن کر کے دوسرے لام (یعنی "لہ" کے لام) سے ملا دیا گیا تو "اللہ" بن گیا اور دوسرے یہ کہ اس (یعنی لفظ اللہ) کی اصل "آلہ" تھی۔ ہمزہ (یعنی الف) کو حذف کر دیا گیا اور اس کی جگہ الف اور لام لائے گئے اور (دونوں) لام یک جا ہو گئے۔ پہلے لام کو دوسرے میں مدغم کر دیا گیا تو "اللہ" بن گیا۔ سیبویہ ہی کے نزدیک اللہ کی اصل "لیہ" لام پر زبر کے ساتھ چھپنے یا پردے میں جانے کے معنوں میں "لا" تھی۔ پس (اس کے) لام پر الف و لام لازم غیہ موضعی کا اضافہ کیا گیا اور ادغام کا عمل جاری کیا گیا۔ [۴]

---

[۱] شاعر، آگرہ اگست ۱۹۳۲ء ص: ۱۵

[۲] دوسری صدی ہجری کا مشہور عالم نحو، پورا نام ابوالحسن عمرو بن عثمان، آبائی وطن فارس کا شہر بیضا، مقام ولادت بصرہ، سال وفات ۱۶۰ھ کے حدود میں۔

[۳] لیس عربی میں کلمہ نفی بھی ہے اور فعل ماضی بھی۔ کچھ لوگ اس کی اصل "لَیِسَ" بتلاتے ہیں جس کی "ے" کو ساکن کر کے لَیْسَ بنا لیا گیا ہے۔ بعض لوگ اسے "لا" (یعنی نہیں) اور "أیس" (یعنی موجود) سے منتقل مانتے ہیں یعنی لا موجود۔ اس ترکیب "لا أیس" میں ہمزہ یعنی الف کو ساقط کر کے "لام" کو "ی" سے ملا دیا گیا تو لیس بن گیا۔ اس عمل میں "لا" کا ہمزہ یا الف بھی ساقط ہو گیا کیونکہ اس کے سقوط کے بغیر "لام" اور "ی" کا ادغام ممکن نہیں۔ مکتوب پروفیسر عبدالرب عرفان کاشی (ناگور) مرقومہ ار جنوری ۱۹۹۵ء۔

[۴] برائے عبارت فارسی رجوع کنید غیاث اللغات لفظ اللہ کے تحت، ص: ۴۱ و ۴۲

صاحبِ غیاث کی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ لاہ۔ل اہ الاہ پر "ال" کا اضافہ۔ال ل لہ رادغام کے عمل سے دونوں لام اور "ہ" مل جائیں گے اور درمیان کا الف مقصورہ کی صورت میں رقم ہوگا یعنی اللہ۔اس سے واضح ہوا کہ اللہ میں دو لام ہیں۔اس لیے للہ کے ۶۵ عدد بغیر مشدد کے لیے جائیں گے۔صاحبِ غرائب الجمل نے بھی اس مادہ ۔ "للہ الحمد مبارک تمہیں ساجد شادی "کو دو لام کی سند کیتحت لکھا ہے[۱] سید محمد علی جویا نے مسند نشینیِ نواب محمد ابراہیم علی خاں والیٔ ٹونک کے سلسلہ میں صنعتِ ترصیع میں جو مثنوی کہی اس میں حرفِ مشدد کو ایک دفعہ حساب میں لیا ہے:

نیا کردے ساقی ترا راج ہے　۱۲۸۶ھ　مسرّت نشاں کیفِ نو آج ہے　۱۲۸۶ھ
تجلیِ رخ سے نہیں تاب حال　۱۸۷۰ء　نگاہ سب کی ٹکڑے کتاں کی مثال[۲]　۱۸۷۰

ڈپٹی کلکٹر عبدالغفور نسّاخ نے اپنے ایک شاگرد کی وفات کے مادّہ تاریخ میں "جنت" کی نون کو ایک بار محسوب کیا ہے:

"داخلِ جنتِ نعیم ہوئے"[۳] ۱۲۷۹ھ

مومن نے اپنی دادی کی وفات کے مادّہ ۔دخلت بالنعیم[۴] سے ۱۲۳۷ھ حاصل کیے۔شہزادی زیب النساء قلعہ ستارہ کی فتح کی تاریخ۔شقِ ستارہ آمد[۵]۔سے ۱۱۱۱ھ بر آمد کی،یہاں مزید امثلہ سے قطع نظر اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تاریخ گوئی میں ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں حرفِ مشدد کو ایک ہی بار شمار کیا گیا۔اس ذیل میں دو آرا پیش ہیں۔

ڈاکٹر قیام الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

"Letters bearing تشدید mark ,which are pronounced twice,are to be taken as one letter. However,the word اللہ is taken to yield 66,in cluding the second ل" [۶]

ڈاکٹر خالد حسن قادری (لندن) کہتے ہیں کہ:

---

۱ غرائب الجمل ص ۱۲۰۔　۲ خیابان تواریخ ص ۲۔۱۱۔
۳ سخن شعراء از عبدالغفور نساخ ص ۴۲۵،اترپردیش اردو اکادمی،لکھنو ۱۹۸۲ء
۴ دیوان مومن ص ۱۲۵ مطبع رفاہ عام الہ آباد ۱۱ر فروری ۱۸۴۶ء
۵ واقعات دارالحکومت دہلی ۱:۵۲۸　۶ Corpies Of Arabic and Persian Inscriptions Of Bihar P.373, Appendix I. Patna1973 A.D.

"The letters carring a ّ though doubled, are since they are written only once ,only counted once,"[1]

بہر حال سابقہ مثالوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اساتذہ نے کسی قاعدہ اور اصول کی پابندی نہیں کی اور اس طرح صرف ضرورت کا پاس رکھا۔ لیکن ہمیں اگر تاریخ گوئی کو ایک فن کی حیثیت دینا ہے تو لازم ہے کہ حرف مشدد کے متعلق بھی قطعی فیصلہ صادر کر دیا جائے۔

۵۔ کاف بیانیہ

حرفِ کاف جب فارسی میں الفاظ ما قبل یا مابعد علیحدہ لکھا جاتا ہے تو اظہار حرکت کے لیے اس کے بعد "ہائے ہوز" بھی لکھا جاتا ہے جیسے این کہ، چناں کہ وغیرہ چونکہ اردو میں بھی یہی عمل جاری ہے۔ مثلاً اس سے کہو کہ وہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس حرف تردید و شرط کی کتابت میں دو حرف یعنی "ک" اور "ہ" موجود ہیں۔ اس لیے فن تاریخ گوئی کے بنیادی اصولِ کتابت کے تحت اس کے ۲۵ عدد لینے چاہئیں لیکن اساتذۂ فن اس میں بھی مجمع علیہ نہیں ہیں۔ چنانچہ کاف بیانیہ کے ۲۰ اور ۲۵ دونوں عدد حسب ضرورت شمار کئے گئے ہیں درد کاکوروی کا قول ہے کہ دونوں فریقوں کی مثالیں موجود ہیں چاہے ۲۵ عدد لیجئے چاہے ۲۰ مگر شرط یہ ہے کہ تاریخ عمدہ اور بلا تعمیہ (تدخلہ) و تخرجہ ہو۔"[2]

ہم پہلے کاف بیانیہ کے ۲۰ عدد اخذ کرنے کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

نواب شاہنواز خاں ابن ذکریا خاں حاکم ملتان کی شہادت (۱۲۳۳ھ) کے مادۂ تاریخ میں کاف بیانیہ کے ۲۰ عدد لیتے ہوئے مطلوبہ سنہ بر آمد کیا ہے:

جستم چوں سالِ مشہدِ آں غازیِ شہید
گفتا خرد کہ حاکم ملتان شہید شد[3] ۱۲۳۳ھ

مولانا محی الدین خاں ذوقؔ کاکوروی نے حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ کی وفات کے مادۂ تاریخ میں بھی کاف بیانیہ کے ۲۰ عدد شمار کئے ہیں:

"آہ عمرے شد کہ سیلِ اشک وایں دامانِ ما" ۱۲۷۵ھ

---

[1] Janah Maulana Hamid Hasan Qadri and The Art Of and The Chronogram 1988A.D.
By Dr. Khalid Hasan Qadiri (London) Qadini Academy Karachi 1989 A.D

[2] ماہنامہ شاعر ستمبر ۱۹۳۲ء ص ۱۵

[3] مقالہ الواح الصنادید از پروفیسر محمد اسلم، لاہور، مشمولہ ماہنامہ برہان دہلی بابت جولائی، ۱۹۸۸ء ص ۵۴۔

اور ہجری سنہ کے مطابق عیسوی ۱۸۵۸ء کے مادہ میں بھی ۲۰ عدد لیے ہیں:

"دل خوش آں عہد کہ سازد برگ جرعئے نبود" [۱] ۱۹۵۸ء
۲۰

مولوی احمد کبیر حیرت نے اپنی تصنیف "تاریخ کملا" کی دونوں جلدوں میں جو قطعات تاریخ پر مشتمل ہیں، کاف بیانیہ جہاں جہاں وارد ہوا ہے، ۲۰ عدد شمار کرتے ہوئے سنہ مطلوب بر آمد کیا ہے اور یہ سلسلہ جلد اول کے صفحہ ۵۲ سے شروع ہو کر جلد دوئم کے صفحہ ۳۲۶ پر ختم ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے، شیخ عبدالرحمٰن سخاویؒ م ۸۵۲ھ کا مادۂ تاریخ ہے: "دیدم کہ بخانۂ جہاں بود" [۲] ۸۵۲ھ یعنی وکیل حیرت صاحب کا رجحان قطعیت کے ساتھ ۲۰ عدد کی طرف ہے۔ لیکن اس کے بر خلاف اکبری عہد کے معتبر تاریخ خواجہ حسن ثنائی مروی کا رجحان حسب سہولت ۲۰، اور ۲۵ عدد اخذ کرنے کی طرف ہے۔ ایک قصیدہ کی مثال پہلے گذر چکی ہے۔ اسی قصیدہ کے درج ذیل شعر میں کاف بیانیہ کے ۲۵ عدد اخذ کیے ہیں:

"شاد شد دلہا کہ باز از آسمان عدل و داد" ۹۶۳ھ
۲۵
"باز دنیا زندہ شد کز مہر ایام بہار" [۳] ۹۷۷ھ

لطف کی بات یہ ہے کہ اسی قصیدے کے ایک شعر کے مصرع ثانی میں اس لفظ (کہ) کے دو جگہ ۲۰، ۲۰ عدد شمار کیے ہیں:

"کس نیارد ہدیۂ زیں بہ اگر دارد کسے" ۹۶۳
"ہر کہ دارد گو بیا چیزے کہ داری گو بیار" [۴] ۹۷۷ھ
۲۰

شاہجہانی عہد کے شاعر مرزا طہماسپ قلی ترک نے شہزادۂ عالی جاہ دارا شکوہ کی کتخدائی کے موقعہ (۱۰۴۳ھ) پر بلند و بانگ دعوئی کے ساتھ جو قصیدہ کہا اس میں کاف بیانیہ کے ۲۵ عدد محسوب کیے ہیں، صرف وہ اشعار لکھے جاتے ہیں جن میں کہ واقع ہوا ہے:

بحمد اللہ کہ شد دیگر زسعی نائب سلطاں ۱۰۴۳ھ
۲۵
رواج التیام افزوں حدود وصل آباداں ۱۰۴۳ھ

---

[۱] تفصیل مزارات خانقاہ کاظمیہ کاکوری از ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی ص ۲۶، کتب خانہ انوریہ کاکوری شریف ۱۴۱۱ھ / ۱۹۹۰ء

[۲] تاریخ کملا: ۲: ۵۰۲ مطبوعہ دریونین پریس اشیخ واقع بانکی پور (پٹنہ) ۱۳۰۲ھ

[۳] ماثر جہانگیری ص ۵۔ [۴] ایضاً ص ۷

زہے شاہی نکو آئیں کہ[۲۵] باد اتمام اقبالش　۱۰۴۳ھ

یمن عہد را باز دیسار جود را ساماں　۱۰۴۳ھ

یقیں دانم کہ[۲۵] قصد او کند حل ہمہ مشکل　۱۰۴۳ھ

مدتیح جود او دارد دلا ہر مشکلے آساں　۱۰۴۳ھ

محبت بیں کہ[۲۵] دارد بر دوام جد و کد او　۱۰۴۳ھ

بود پیش کف نامی وی سنگ و گہر یکساں　۱۰۴۳ھ

کسے گر زیں نمط شعری تواند گفت بسم اللہ

بشاگردی او خط می دہم در حضرت خاقاں [۵]

واضح ہو کہ اس قصیدے میں ایک شعر سے چار طرح تاریخیں بر آمد کرنے کا التزام کیا گیا ہے یعنی اول و دوم ہر مصرعے سے، تیسرے پورے شعر کے حروف منقوطہ سے اور چوتھے مکمل شعر کے حروف مہملہ سے آخری شعر میں صرف دعویٰ ہے تاریخ نہیں۔

تاریخ گوئی میں چونکہ حروف مکتوبی کے عدد شمار کئے جاتے ہیں اور اگرچہ کاف بیانیہ اور حروف جار "بہ" یا حرف نفی "نہ" میں باعتبار تلفظ ہائے مختفی کا وجود نہیں مگر چونکہ ہائے ہوز حروف ابجد میں شامل ہے اور اپنی عددی مقدار (۵) رکھتا ہے۔ لہٰذا کاف بیانیہ کے ۲۵ عدد شمار ہوں گے، اور بایں سبب اساتذۂ فن کی اکثریت نے اس کے ۲۵ عدد ہی شمار کئے ہیں اور اصول کتابت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس فن کے شعرائے اردو نے کاف بیانیہ کے ۲۵ عدد ہی لیے ہیں مثلاً شیخ امام بخش ناسخ نے اس مادہ میں:

"افسوس کہ موت نے گھیسا[۲]" ۱۲۴۳ھ

کاظم حسین نے بھی درج ذیل تاریخ میں اس کے ۲۵ عدد ہی شمار کئے ہیں۔

"یہ ایسی سوئیں خدیجہ کہ پھر نجاگیں حیف[۳]" ۱۳۱۸ھ

۶۔ تائے مربوطہ (ۃ):

گول ۃ کو تائے مدورہ، تائے موقوفہ اور تائے موصولہ بھی کہتے ہیں۔ تاکہ تائے طویلہ

۱۔ مفتاح التواریخ از طامس ولیم بیل ص ۱۴۱ نیز نشید کاظم (دیوان تواریخ) از سید کاظم حسین ص ۸۔ ۶۷، اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۰۸ء

۲۔ دیوان ناسخ ۲: ۲۱۹ مطبع نامی منشی نولکشور، لکھنو فروری ۱۸۹۳ء بار ششم۔

۳۔ نشید کاظم ص ۱۱۵۔

(مطیقہ) سے امتیاز ہو سکے۔ تائے فوقانی (ۃ) عربی میں کم از کم بارہ معنی میں استعمال ہوتی ہے لیکن تاریخ گوئی میں صرف دو معنی کے ساتھ ہی اس کا تعلق ہے۔ اول تائے تانیث جو کلمۂ اسم کے آخر میں آتی ہے اور حالت وقف میں "ہا" پڑھی جاتی ہے جیسے روضۃ، دوحۃ (درخت) وغیرہ۔ دوسرے کبھی جنس میں سے صیغہ واحد پر دلالت کے لیے جیسے شجرۃ (ایک درخت) تمرۃ (ایک عدد کھجور) وغیرہ۔ دوئم یہ کہ تائے مدورہ مفردہ جو پانچ حرفوں کے بعد آتی ہے یعنی دال مہملہ، ذال معجمہ، رائے مہملہ، زائے معجمہ اور "واو" کے بعد جیسے "اعادۃ" (لوٹانا) "اعاذۃ" (پناہ میں لینا) ارادۃ، اجازۃ (پروانگی دینا VISA) اخوۃ، زکوٰۃ وغیرہ میں۔ اسے کبھی دامن دار بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً اباحۃ، مراۃ (آئینہ) حکمۃ اور قطعۃ وغیرہ۔ [1]

کتابت کی مذکورۃ الصدر دونوں صورتوں میں جو دراصل ایک ہی ہیں، عدد وشمار کرنے میں اساتذہ کے درمیان شدید اختلاف رہا ہے کہ اس کے پانچ عدد لیے جائیں یا چار سو اور انہوں نے کسی اصول کا خیال رکھے بغیر جس طرح تاریخ برآمد ہو سکی، عدد وشمار کر لیے ہیں۔ جیسا کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار "حساب الجمل" نے لکھا ہے کہ "ۃ" "ھایاتا" شمار کیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ آیا وہ وقف میں واقع ہوئی ہے یا نہیں۔ [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی) کے مقالہ نگار حساب الجمل کی رائے بھی یہی ہے:

THE ,TA, MARBUTA MAY BE COUNTED AS A ,HA, OR AS A ,TA, ACCORDING TO WHETHER IT OCCURSE IN PAUSE (WAKF) OR IN LIASION (DARDJ) [3]

اساتذہ کے مادہ کے مادہ ہائے تاریخ میں ہمیں یہ تضاد آسانی سے فراہم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سلطان محمد عثمانی نے ۸۵۷ھ میں استنبول [4] (قسطنطنیہ) فتح کیا تو کسی فاضل نے یہ تاریخ کہی:

بلدۃ طیبۃ [5] ۸۵۷ء

☆☆☆

---

[1] مصباح اللغات ص ۸۱ نیز ملہم تاریخ ص ۲۔ ۱۴۔ [2] ۸: ۱۷۶

[3] CIT: HISAB AL DJUMAL

[4] استانبول کی اصل "اسلام ہے، بول ترکی میں شہر کو کہتے ہیں یعنی اسلام کا شہر یا اسلام آباد، ڈی۔ اے کیمرن نے اپنی مصری زبان کی لغت میں اس کا املا استانبول بھی لکھا ہے۔ دیکھئے لغات ہیرا مولفہ منشی لچھمن لال بدایونی ص ۸۹، ساہتیہ کلا بھون، الہ آباد ۱۹۶۶ء

تلک عشرة کاملة

نیاز فتحپوری کے دس سوالوں کے جوابات

(سعید احمد)

نگار لکھنؤ میری نظر سے نہیں گذرتا۔ ۱۹ ستمبر کو میں مسوری سے واپس آیا تو دفتر برہان میں مجھ کو اگست کا نگار ملا، اور اس کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا سے متعلق بعض نوجوان دوستوں کا ایک خط بھی ملا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ نیاز صاحب نے نگار میں علماء کرام سے جو دس سوال کیے ہیں، مہربانی فرما کر نیاز صاحب کی خاطر نہیں تو کم از کم ہم لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے ہی ان کے جوابات لکھ دیجئے۔ یہ واقعہ ہے کہ میں نیاز صاحب کو کسی سنجیدہ علمی بحث کا اہل نہیں سمجھتا، لیکن اب محض اپنے نوجوان دوستوں اور بعض ناواقف مسلمانوں کی خاطر یہ جوابات لکھ رہا ہوں۔ نیاز صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ فنون سے بے خبر ہونے کے باوجود ہر فن کی اصطلاحات بہت بے محل استعمال کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ ان سوالات میں بھی انہوں نے اپنے آپ کو فلسفی ظاہر کرنا چاہا ہے۔ اس بنا پر لامحالہ جوابات بھی اسی طریقہ پر دیئے گئے ہیں۔ جوابات میں نے قصداً مختصر لکھے ہیں۔ کیونکہ مقصد محض جواب ہے۔ کوئی علمی بحث و گفتگو نہیں۔ بہتر ہوگا کہ قارئین کرام جوابات پڑھنے سے پہلے نگار بابت اگست ۱۹۴۰ء اپنے سامنے رکھیں اور ہر سوال کا الگ الگ جواب پڑھتے چلے جائیں۔

(۱) قرآن مجید (بحیثیت کلام خداوندی ہونے کے) خدا کے ساتھ از خود وجود میں آیا ہے۔ نیاز صاحب اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے قرآن مجید کا خدا کی طرح قدیم ہونا لازم آتا ہے۔ حالانکہ قدیم سوائے خدا کے کوئی دوسری چیز نہیں ہے لیکن ان کا اعتراض سراسر لغو اور باطل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب فلسفہ کے ابتدائی طالب علم کی طرح یہ بھی جانتے

کہ قدیم اور واجب الوجود میں کیا فرق ہے؟ تمام علماء کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ تعدد وجباء محال ہے، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ واجب الوجود ایک سے زیادہ ہوں۔ کیونکہ واجب الوجود کی ماہیت عین وجود ہے۔ اس لیے یہ کلی ایسی ہے جو منحصر فی فرد واحد ہے۔ اس کے لیے تعدد ہو ہی نہیں سکتا۔ باقی رہا قدیم تو اس کے لیے کسی کے نزدیک بھی تعدد محال نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب منطق و فلسفہ عقل اول کو ذات واجب الوجود کی طرح قدیم مانتے ہیں اور معلول اول ہونے کی وجہ سے واجب الوجود اور عقل اول میں صرف تقدم و تاخر ذاتی کے قائل ہیں تقدم و تاخر زمانی کے نہیں۔ اور آپ دور کیوں جاتے ہیں۔ عالم کو ہی دیکھ لیجئے۔ معتزلہ کا ایک بڑا فرقہ اور حکمائے اسلام میں فارابی، ابن سینا اور ابن رشد خدا کو واجب الوجود اور قدیم ماننے کے ساتھ ساتھ عالم کو بھی قدیم تسلیم کرتے ہیں۔ افسوس ہے نیاز صاحب منطق و فلسفہ کی ابجد سے بھی واقف نہیں، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ ہر ممکن الوجود کے لیے حادث ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ قدیم بھی ہو سکتا ہے۔

(۲) جی ہاں! قرآن شریف نام ہے ان الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں۔ اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اس پر نیاز صاحب کا اعتراض یہ ہے "تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا۔" سخت افسوس ہے کہ نیاز صاحب نے یہ اعتراض کر کے بھی اپنی انتہائی لاعلمی کا ثبوت دیا ہے، انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کسی شے کی صفت عرضی کے عدم سے خود اس شے کی ذات اور ماہیت کا عدم لازم نہیں آتا، مثلاً ہنسنا، رونا، بات کرنا، کھانا اور پینا، یہ سب انسان کی صفات عرضیہ ہیں۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان سب کے معدوم ہو جانے سے موصوف یعنی انسان کا معدوم ہو جانا لازم نہیں آتا۔ پس اسی طرح قرآن مجید کے الفاظ و حروف کا پریس سے چھپنا اور انسان کی زبان و حلق سے ادا ہونا یا ان الفاظ کا ایک خاص کیت و مقدار کے کاغذ پر مرتسم ہونا۔ یہ سب قرآنی الفاظ کی صفات عرضیہ ہیں۔ اس بنا پر اگر قرآن مجید کا ایک نہیں بلکہ سب نسخے بھی ضائع ہو جائیں تب بھی اس سے قرآن مجید کا ضائع ہو جانا لازم نہیں آتا۔ وہ اگر کاغذ پر جلوہ نما نہیں ہوگا تو لاکھوں انسانوں کے

سینوں میں محفوظ ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ کسی سینہ میں بھی نہ ہوگا تو عالم حقیقت میں ضرور ہوگا۔ موجودہ دور ترقی میں جبکہ سائنس داں زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے متعلق یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ یہ الفاظ زبان سے نکلنے کے بعد فنا نہیں ہوتے بلکہ وہ فضا میں موجود رہتے ہیں، یہ سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کے تمام نسخے اگر ضائع ہو جائیں تب بھی نفس قرآن مجید فنا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ باقی رہے گا۔

(۳) قرآن پاک خدا کا کلام ہے اور نیاز صاحب نے جو دو صورتیں بتائی ہیں ان میں سے وہ ایک صورت کے ساتھ قائم ہے یعنی وہ خدا کا عین ذات نہیں، بلکہ صفت ربانی ہے۔ اب نیاز صاحب اس پر اعتراض یہ کرتے ہیں کہ "چونکہ خدا کی ہر صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے۔ اس لیے یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نیاز صاحب از راہ کرم خدا کی دوسری صفات مثلاً علم، قدرت، خلق وغیرہ کی نسبت بتائیں کہ وہ انہیں قدیم مانتے ہیں یا نہیں جیسا کہ خود ان کے بیان سے ثابت ہوتا ہے۔ وہ یقیناً انہیں قدیم مانتے ہیں کیونکہ واجب الوجود محل حوادث نہیں ہو سکتا۔ اب نیاز صاحب اس پر غور کریں کہ علم، خلق، قدرت یہ سب صفات قدیم ہیں۔ مگر ان کا تعلق حوادث کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ تعلق بھی خدا ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں "خدا نے زید کو پیدا کیا۔ خدا نے اپنی قدرت سے مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں فتح دی" اسی طرح جو چیزیں آج کل کی ذہنی ودماغی ترقیات کی پیداوار ہیں مثلاً ہوائی جہاز، موٹر، ریل، تار برقی، آبدوز کشتیاں وغیرہ ہم ان سب چیزوں کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں خدا کے علم میں ہیں۔ تو اب بتایئے کہ کیا ان سب چیزوں کے حادث ہونے سے خدا کی صفت علم، خلق اور قدرت کا حادث ہونا، یا خدا کی ان صفات کے قدیم ہونے کے باعث ان تمام حادث چیزوں کا قدیم ہونا لازم آتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ تمام "مخلوق" "معلوم" اور "مقدور" چیزیں حادث ہی رہیں گی۔ اور اللہ کی صفت خلق، علم اور قدرت قدیم اور اس کے باوجود ان سب کی نسبت اللہ کی ہی طرف ہوگی کیونکہ ان تمام چیزوں کے وجود وحدوث کا سرچشمہ خدا کی یہ صفات ہی ہیں۔ پس اسی پر قرآن مجید کے عربی الفاظ وحروف کو قیاس کر لیجئے کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان قدیم نہیں حادث ہے لیکن اس

کے باوجود چونکہ قرآنی الفاظ و حروف کا مبداءِ وجود اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا تعلق ہے اس بنا پر ان الفاظ و حروف کو بھی کلام ربانی کہا جائے گا۔ اور اب کلام ربانی کہنے میں نہ عربی زبان کا حدوث مخل ہو سکتا ہے اور نہ ان واقعات حادثہ کا ذکر مانع ہو سکتا ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ تمثیلاً یہ عرض کرنا بے محل نہیں ہوگا کہ آپ دیکھتے ہیں بجلی کا خزانہ (POWER HOUSE) ایک جگہ موجود ہوتا ہے اور جہاں جہاں بجلی کے تار اور قمقے (BULBS) لگا دیئے جاتے ہیں وہاں بجلی پہنچ جاتی ہے۔ تو کیا کوئی شخص کسی خاص کمرہ میں ایک مخصوص قمقمہ میں بجلی کی روشنی دیکھ کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس کا تعلق بجلی کے خزانہ سے نہیں ہے؟ یا آفتاب کی شعاعیں مختلف مکانوں کے مختلف الاشکال روشندانوں میں سے چھن چھن کر مکان میں آتی ہیں تو کیا کوئی عقلمند یہ سمجھتا ہے کہ ان مختلف الشکل شعاعوں کا منبع آفتاب نہیں ہے؟ پس اسی طرح اگر اللہ کی صفت کلام کا ظہور عربی کے مخصوص الفاظ و حروف میں ہو رہا ہے تو کیا محض عربی زبان کے حادث ہونے کی وجہ سے ہم قرآن مجید کے کلام خداوندی ہونے سے انکار کر سکتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔

(۴) چوتھے سوال میں نیاز صاحب نے قرآن مجید کو "نطق خداوندی" قرار دے کر سخت ترین مغالطہ دینا چاہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کو کلام خداوندی تو سب مسلمان مانتے ہیں لیکن اسے "نطق خداوندی" کوئی بھی نہیں کہتا۔ خود قرآن نے اللہ تعالیٰ کے لیے صفت کلام ثابت کی ہے۔ صفت نطق نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے "وكلم الله موسى تكليماً" اور اللہ نے حضرت موسیٰ سے خوب کلام کیا۔ اس پر نیاز صاحب اعتراض کرتے ہیں کہ کلام بغیر نطق کے ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن ہمیں سخت حیرت ہے کہ کس طرح کوئی فہمیدہ انسان ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ ایک شاعر اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا اور پوری غزل کاغذ پر لکھ کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ یہ غزل اسی شاعر کا کلام ہے یا نہیں؟ کوئی شبہ نہیں کہ کلام ہے مگر س کے باوجود "نطق" بالکل نہیں پایا جا رہا ہے۔ اور اسے تو سب جانتے ہیں کہ بعض اوقات زبان حال سے دل کا مطلب ایسے بلیغ پیرایہ میں ادا ہو جاتا ہے کہ زبان قال سے بھی ادا نہیں ہوتا۔ اور اسی بنا پر کسی نے سچ کہا ہے۔ "در خموشی معنیست کہ در گفتن نمی آید"

عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

وللقلب على القلب دليل حين يلقاه
وفى الناس من الناس مقاييس واشباه
وفى العين غنى للمرء ان تنطق افواه

ایک اور شاعر نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس نے زبان چشم کی گویائی کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔

ترى عينها عينى فتعرف وحيها   وتعرف عينى مابه الوحي يرجعُ

ایک شاعر آنکھ کے ذریعہ کسی مافی الضمیر کو اپنے مخاطب پر ظاہر کر دینے کو آنکھ کا "نطق" بتاتا ہے۔ سنیے۔

العين تبدى الذى فى نفس صاحبها   من المحبة او بغض اذا كانا
والعين تنطق والا فواه صامتة   حتى ترى من ضمير القلب تبياناً

اسی سلسلہ میں ایک اور شعر پیش خدمت ہے۔ جس میں شاعر کہتا ہے کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ بات بھی آنکھ سے ظاہر کی جاسکتی اور آنکھ سے ہی سمجھ لی جاسکتی ہے۔

وعين الفتى تبدى الذى فى ضميره   وتعرف بالنجوى الحديث المغمّسا

ممکن ہے نیاز صاحب اور ان کے ہم خیال اعتراض کریں کہ ان اشعار سے تو صرف حدیث عشق و محبت یا جذبہ نفرت و عداوت کا آنکھ کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔ پوری گفتگو بغیر نطق کے [illegible] طرح ہو سکتی ہے؟ تو انہیں سمجھنا چاہئے کہ جو کچھ عرض کیا گیا محض برائے تمثیل ہے۔ اس [illegible] یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جب دو دل علاقہ محبت کے باعث پائے گفتگو کو درمیان میں [illegible]ئے بغیر ایک دوسرے کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس مطلب کا اظہار ہوگا تو الفاظ کے ذریعہ ہی ہوگا۔ اور ان الفاظ کا انتساب بھی "متکلم" کی طرف ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ان کے مفہوم و مراد کا۔ تو پھر اس میں کونسا عقلی استبعاد ہے کہ ذات احدیت اور حقیقت محمدیہ میں قرب قاب قوسین اور اتصال معنوی ہونے کی بنا پر وقتاً فوقتاً مکالمہ ہو اور وہ اہل عالم کے لیے قرآن مجید کی شکل میں ظاہر ہو۔ خود قرآن مجید نے مکالمہ الٰہی کی صورت اس طرح بیان کی ہے۔

وماكان لبشر أن يكلمه الله الا وحيا او من وراء حجاب　　کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے لیکن وحی کے ذریعہ یا پردہ کی آڑ سے

جس طرح چشم حبیب کی گویائی سے صرف محب ہی مطلب و مراد سمجھ سکتا ہے اسی طرح ذات احدیث سے شرف ہمکلامی صرف انہی برگزیدہ ہستیوں کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جو منصب نبوت و رسالت پر فائز ہونے کی وجہ سے مہبط وحی بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ارشاد ہے۔

منهم من كلم الله ان پیغمبروں میں سے ہی وہ ہیں جن سے خدا نے کلام کیا۔

الغرض کسی کا کلام وہ ہے جس کے ذریعہ اس کے مافی الضمیر کا اظہار ہو، خواہ عضلات واعصاب کی راہ سے ہو یا کسی اور طریقہ سے[1]۔ اور چونکہ انبیاء کو غایت روحانی لطافت وپاکیزگی کے باعث عالم مجردات کے ساتھ بہت کچھ اتصال باطنی ہوتا ہے، اس لیے وہ صرف عالم تجرد کے حقائق کو نیہ و واقعات نفس الامریہ کا ہی مشاہدہ نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات حقیقت الٰہیہ سے قریب ہو کر ارشادات ربانی کو سنتے اور ان سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس افادہ واستفادہ، تعلیم و تعلم اور کلام و خطاب کے لیے نہ عالم مادیات کی طرح نطق و گویائی کی ضرورت ہے اور نہ ظاہری گوش و سمع کی لیکن چونکہ عالم تجرد کی کوئی چیز ہمارے مشاہدہ میں اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ اس پر عالم ناسوت کے کسی لازمہ کا خول نہ چڑھا ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہی ارشادات ربانی جن کو خدا نے بیان فرمایا اور پیغمبروں نے سمجھا ہمارے سامنے آئیں تو انہیں الفاظ و کلمات کے جامہ میں آئیں جنہیں ہم سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ لباس ملبوس کے تابع ہوتا ہے۔ اس لیے ملبوس کی نسبت جس چیز کی طرف ہوگی لباس بھی اسی کی طرف منسوب ہوگا۔ مثلاً ہم کرتہ پہنتے ہیں تاکہ ہمارا بدن ڈھکے۔ تو اب دیکھئے بدن کی نسبت ہماری طرف ہوتی ہے۔ تو کرتہ بھی ہماری ہی طرف منسوب ہوتا ہے یعنی ہم جس طرح "ہمارا بدن" کہتے ہیں۔ اسی طرح ہم ہمارا کرتہ بھی کہتے ہیں۔ اور ایسا کہنا بر سبیل مجاز یا بہ طور تشبیہ واستعارہ نہیں بلکہ بر سبیل حقیقت ہوتا ہے۔ اور اگر بالفرض خدا کے لیے نطق مان بھی لیا جائے اور نیاز صاحب کے قول کے مطابق انسان، نبی اور خدا کے سب کے لیے نطق پایا بھی جائے تو اس سے خدا کی صفت میں

---

[1] جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ نے اپنی مشہور کتاب "البیان والتبیین" جلد اول باب البیان کے تحت اس موضوع پر خوب بحث کی ہے مزید تفصیل کے لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مماثل ہونا کس طرح لازم آتا ہے۔ قرآن مجید میں خدا نے اپنے لیے صفت سمع و بصر ثابت نہیں کی؟ تو کیا نعوذ باللہ اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سننے اور دیکھنے والے بندے سننے اور دیکھنے کی صفت میں خدا کے مماثل ہیں؟ پھر لیس کمثله شیء کا مطلب کیا ہوگا؟

(۵) جی ہاں؟ قرآن مجید جس سلسلہ (غالباً ترتیب) سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے مختلف ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ نیاز صاحب کے اعتراض کے بموجب اس سے قرآن مجید کا فنا ہو جانا کس طرح لازم آجاتا ہے۔ نیاز صاحب نے اپنے اعتراض کے لیے جو دلیل قائم کی ہے اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے منطق کی مشہو شکل اول یعنی العلم متغیر وکل متغیر حادث فالعلم حادث پڑھی ہے۔ لیکن انہیں اس کی خبر نہیں کہ قرآن مجید کا ترتیب خاص کے ساتھ آسمان سے نازل ہونا قرآن مجید کی ذاتیات میں داخل نہیں، بلکہ عرضیات میں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی شے کی عرضیات میں سے کسی عرضی کا تغیر پذیر ہونا یا فنا ہو جانا خود اس شے کی ذات کی حدوث و قدامت پر مطلقاً اثر انداز نہیں ہوتا۔ انسان کے لیے جب تک حیوان ناطق ہونا پایا جائے گا۔ بہر حال وہ انسان رہے گا خواہ اس کے اعضاء کی ترتیب یہی رہے یا کچھ اور ہو جائے۔ ایک تخت کے پایوں کو آپ اول بدل دیجئے۔ اس کی مقدار جسمانی کو گھٹا کر بڑے سے چھوٹا کر دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ پھر بھی تخت ہی رہے گا۔ شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں آج جس ترتیب سے رائج ہیں۔ اگر اس کو بدل دیا جائے اور باب اول کو باب دوم اور باب دوم کو باب اول کی جگہ رکھ دیا جائے تو کیا اس ترتیب کے بدل جانے سے گلستاں اور بوستاں کو "کلام سعدی" کہنا نادرست ہوگا؟

(۶) جی ہاں! قرآن مجید نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالت مآب پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں شانِ نزول کہتے ہیں۔ اب نیاز صاحب اس پر اعتراض یہ کرتے ہیں "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا، وہ آیت بھی موجود نہ تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوح محفوظ میں ازل سے درج تھا۔ بے معنی ہو جاتا ہے۔" سخت حیرت ہے کہ کسی موقع و محل کے مناسب کسی آیت کے نازل ہونے سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ وہ آیت کہیں بھی موجود نہ تھی، معلوم نہیں نیاز صاحب کو اس کی خبر ہے یا

نہیں کہ زمانہ کی تعیین محدد جہات کی حرکت سے ہوتی ہے۔اس لیے زمان ومکان کی قید اور تفریق صرف ان چیزوں کے لیے ہی ہو سکتی ہے جو ذو جہت ہوں۔ لیکن اتنا تو وہ بھی مانتے ہوں گے کہ حضرت باری عزاسمہ قید زبان ومکان سے بلند وبالا ہے۔اس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل کوئی چیز نہیں۔ تمثیلاً فرض کیجئے کہ ایک شخص بہت اونچے کوٹھے پر کھڑا ہے اور اس بام کے نیچے متعدد کمروں والی ایک عمارت ہے۔ان کمروں میں سے ہر کمرہ میں ایک ایک شخص کھڑا ہوا ہے۔اب اس کے بعد فرض کیجئے کہ مختلف رنگین چیزوں کی ایک مسلسل قطار ہے جو اس عمارت کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک پھیلی ہوئی ہے،اور یہ قطار آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے تو اس صورت میں دیکھئے ہر کمرہ والا صرف اسی چیز کو دیکھتا ہے جو حرکت کرتی ہوئی اس کے سامنے سے گزرتی ہے لیکن اس کے بالمقابل جو شخص اوپر برلب بام کھڑا ہوا ہے وہ بیک نظر تمام چیزوں کو دیکھ رہا ہے،اور ان میں سے ہر چیز کی نسبت اس کے دل میں ایک خیال یا رائے قائم ہے لیکن وہ سب کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار بیک وقت نہیں کرتا۔ بلکہ کمرہ والوں میں سے جس کے سامنے جو چیز آتی ہے وہ اس وقت اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ پس قرآن مجید کا لوح محفوظ میں درج ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوٹھے پر کھڑے ہونے والے شخص کا تمام چیزوں کی نسبت اپنے دل میں ایک یا مختلف خیالات رکھنا اور پھر قرآن مجید کا نجماً نجماً نازل ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ قطار کی تدریجی حرکت کی صورت میں کسی خاص چیز کی نسبت اپنے خیال کا اس وقت ظاہر کرنا جبکہ وہ حرکت کرتے کرتے کسی ایک کمرہ والے شخص کی نظروں کے سامنے آجائے۔ معلوم نہیں ان دونوں میں کونسا استبعاد عقلی ہے۔

نیاز فتح پوری اسی سوال میں آگے چل کر لکھتے ہیں "اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے سے ہی تمام آیات لوح محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں تو پھر ان واقعات وحالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔" اول تو یہ سوال ہی بہت ژولیدہ ہے۔ عبارت میں "تو" کہہ کر نیاز صاحب نے جملہ متقدمہ پر جو متفرع کیا ہے تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں باہمی ربط کیا ہے۔ جس کے باعث بعد والا جملہ پہلے جملہ پر متفرع ہو سکے پھر یہ پتہ نہیں چلتا کہ "ان واقعات وحالات" سے معترض کی مراد کیا ہے؟ اگر ان

سے مراد واقعات ماضی یا حال ہیں تو ان کی نسبت ابھی عرض کیا جاچکا ہے۔ اور اگر ان سے مراد وہ واقعات مستقبل ہیں جن کو قرآن مجید میں بصیغہ ماضی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً واقعات قیامت جیسے اذالشمس کورت واذا الجحیم سعرت۔ یا اتی الساعۃ۔ تو ان کی نسبت عرض یہ ہے کہ یہ اگرچہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات ہیں لیکن چونکہ اللہ کے علم میں ان کا وقوع یقینی ہے اور اس میں ادنیٰ سا شائبہ ریب بھی نہیں اس لیے ان کو بطور جزم و تاکید بصیغہ ماضی بیان کر دیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ نیاز صاحب ادیب ہونے کے باوجود زبان و بیان کے ان اسالیب بلاغت سے بھی واقف نہیں اور پھر اصل بات وہی ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کا فرق و امتیاز صرف ہم بلاگرفتاران مادیت کے لیے ہے، ورنہ اللہ علام الغیوب کے لیے حضرت آدم کا جنت سے نکلنا، فرعون کا دریائے نیل میں غرق ہونا، غزوۂ بدر میں مسلمانوں کا فتحیاب ہونا، اور قیامت میں چاند اور سورج اور ستاروں کا روئی کے گالوں کی طرح اڑ جانا سب برابر ہیں۔

(۷) نمبر ے میں جو سوال کیا گیا ہے، اس کا جواب بھی ۶ نمبر کے ذیل میں آچکا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے ازل میں ہی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ان میں آنحضرت ﷺ کا وجود گرامی بھی تھا اور اس بنا پر قُل سے آپ کو جو خطاب کیا گیا ہے۔ وہ وقت نزولِ آیت کی طرح ازل میں بھی درست تھا۔

(۸) اگر کیا؟ واقعی قرآن مجید خدا کا کلام ہے۔ اب رہا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا اعتراض کہ خدا خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے۔ اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے۔ تو اس کے جواب میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید ہم سب لوگوں کے لیے ایک دستور و لائحہ عمل ہے جس کی روشنی میں ہم عبادات و معاملات انجام دیتے ہیں۔ اور چونکہ خدا ہمیں تلقین کر رہا ہے، اس لیے بندوں کے اسلوبِ کلام پر ہمیں تلقین کی گئی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے بادشاہ کسی سے کہے کہ "بادشاہِ وقت تم کو ان باتوں کی ہدایت کرتا ہے۔" تو کیا اس صورت میں یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ کہنے والا بادشاہ وقت نہیں ہے؟

اس سوال کا دوسرا جزء یہ ہے "سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لے کر ملک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے۔ اور پھر دفعتاً ایاك نعبد سے انداز تخاطب بدل جاتا

ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جارہا ہے کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔" کیا خوب! نیاز صاحب جس کو انداز تخاطب کا بدل جانا کہہ رہے ہیں عربی علم معانی و بیان کی اصطلاح میں اس کو التفات کہتے ہیں۔ یہ التفات چھ قسم کا ہوتا ہے۔ تمام معانی و بیان کی کتابوں میں پوری تفصیل کے ساتھ اس کی مثالیں اور تعریفیں مذکور ہیں اور وہیں آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ التفات سے کلام کا معیار بلاغت کتنا اونچا ہو جاتا ہے، تمثیلاً آپ یوں سمجھئے کہ ایک مقرر کسی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے پہلے سب کو متکلم کی ضمیر یعنی "ہم" سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے "ہم یوں ہی، اسی طرح پستی میں پڑے ہوئے ہیں" پھر جب سامعین اس کی طرف ہمہ تن گوش بن کر بیٹھ جاتے ہیں تو اب وہ بجائے "ہم" کے لفظ "تم" یعنی ضمیر خطاب سے لوگوں کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے "تم لوگ آہ کتنے بے خبر ہو!" علمائے معانی و بیان لکھتے ہیں کہ کلام میں اس طرح تنوع اور تفنن کے پیدا ہو جانے سے بہت زور پیدا ہو جاتا ہے۔ پس یہی حال سورۂ فاتحہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سورۂ فاتحہ کے ذریعہ تلقین کرتا ہے کہ وہ کس طرح اس کی حمد کریں، کس طرح اس سے مدد مانگیں، اور کیونکر اس کی بارگاہ میں دعائیں کریں۔ چونکہ مقصود تلقین و تعلیم تھا اس لیے بہتر سے بہتر انداز بلیغ کے ساتھ مسلمانوں کو تلقین کی گئی۔ اسی میں التفات سے بھی کام لیا گیا۔ مگر اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ سورۂ فاتحہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلی تھی۔ آہ افسوس!

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

(۹) اعتراض نمبر ۹ کا جواب نمبر ۶ کے جواب میں آچکا ہے۔ مگر اس میں نیاز صاحب نے ایک عجیب بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں "قرآن شریف میں بکثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلق بالکل عہد نبوی سے ہے۔ مثلاً ابولہب یا کفار مکہ اور ان کے اصنام وغیرہ؟ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلق عالم کے وقت لوح محفوظ میں منقوش تھا جیسا کہ عام عقیدہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورت مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔" سبحان اللہ ذرا اس عبارت کو بار بار پڑھیے اور غور کیجیے کہ اس کے الفاظ

میں باہمی ربط اور جملوں میں منطقی ترتیب کیا ہے؟ گویا تاریخی کتابوں میں واقعات آئندہ سے متعلق پیش گوئی بھی ہوتی ہے؟ آج فن تاریخ سے متعلق یہ ایک نیا انکشاف ہوا ہے!

(۱۰) آپ کیا کہتے ہیں، یہ تو خود ہم کہہ رہے ہیں کہ جس طرح خدا کے لیے سمع وبصر ہے مگر اس کی حقیقت وہ نہیں جو ہمارے سمع وبصر کی ہے۔ اسی طرح خدا کے لیے کلام کی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ مگر اس کے لیے وہ ہماری طرح زبان اور کان ودہن کا محتاج نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جس طرح اس کو سمیع وبصیر کہا جاتا ہے، اسی طرح اس کو متکلم اور اس کے ارشادات کو اس کا کلام کہا جائے گا۔ عجیب ژولیدہ دماغی ہے کہ ایک طرف تو آپ خدا کی صفات کا قائل ہونے کے باوجود ان کے لیے مادی کیفیات نہیں مانتے اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ اگر قرآن کو خدا کا کلام کہا گیا تو اس سے لازم آجائے گا کہ خدا کے لیے زبان بھی مانی جائے حالانکہ لیس کمثلہ شیٔ۔

ان دس سوالات کے بعد نیاز صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ ہیں چند منجملہ اور شبہات کے جنکی بنا پر میں قرآن پاک کو "منطوق خداوندی" سمجھنے سے مجبور رہوں۔" تو گزارش یہ ہے کہ اگر آپ کو قرآن پاک کے "منطوق خداوندی" سمجھنے سے مجبور ہے تو ہوا کرے۔ لیکن اب جبکہ آپ کے ان سوالات کے شافی جوابات دے دیئے گئے ہیں تو قرآن مجید کو "کلام خداوندی" تو سمجھئے اس میں اب کیا اشکال باقی رہ گیا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں نے اپنی تحریر کو اتمام حجت کے طور پر صرف نیاز صاحب کے دس سوالات کے جواب تک محدود رکھا ہے۔ ورنہ قرآن مجید سے متعلق ان کی تحریروں کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جائے تو بڑی آسانی سے یہ دکھایا جا سکتا ہے کہ نیاز صاحب چند سطروں میں ہی کس قدر متضاد ومتناقص باتیں کہہ گئے ہیں، جن سے ان کی تشویش دماغی کے علاوہ علوم وفنون سے افسوسناک بے خبری کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ اگر نیاز صاحب علم کلام اور فلسفہ سے واقف ہوتے تو کچھ اور نہیں کم از کم اپنی بات نبھانے کے لیے ہی قرآن مجید کے مخلوق وغیر مخلوق ہونے سے متعلق معتزلہ کے عقائد باطلہ اور ان کے کمزور دلائل کی ہی پناہ لے سکتے تھے مگر یہاں تو یہ عالم ہے:

زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا تیرا	(ماخوذ: برہان اکتوبر ۱۹۶۰ء)

صرف اسلام ہی جاپانی قوم کے مسائل کا حل

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۹، ۳۰، ۳۱ اگست ۲۰۰۰ء کو اقوام متحدہ یونیورسٹی۔ ٹوکیو، جاپان میں تنظیم اسلامی کانفرنس اور جاپان کے اسلامک سینٹر کی مشترکہ دعوت سمپوزیم سطح کی ایک کانفرنس ہوئی، کانفرنس کا موضوع تھا "مشرقی ایشائی ممالک میں اسلام کا کردار"

اس کانفرنس میں تنظیم اسلامی کانفرنس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عزالدین عراقی، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ صالح العبید، سعودی عرب میں مذہبی امور کے وزیر ڈاکٹر عبدالعزیز آل شیخ، جاپانی وزیر خارجہ، اقوام متحدہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، اسلامی یونیورسٹی کولالمپور کے وائس چانسلر، پاکستان کے سابق وزیر مذہبی امور راجہ ظفرالحق اور ٹوکیو میں اسلامی و عرب ممالک کے سفراء بڑی تعداد میں شریک ہوئے، اس کے علاوہ دیگر اسلامی ملکوں کے تقریباً تین سو دانشوروں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہوئے ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نے سمپوزیم کی پہلی نشست میں مندرجہ ذیل مقالہ پیش کیا۔

سائنس اور ٹکنالوجی اور مادی وسائل کی دنیا میں مغربی قوموں نے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جن پر آج عقل حیران ہے۔ زندگی کو ترقی یافتہ اور خوشگوار بنانے کے لیے ایسے وسائل دریافت کرلیے ہیں جن کا تصور بھی آج سے قبل کی نسلوں کے لیے محال تھا، اپنی انہی سائنسی ترقیوں اور مادی کامیابیوں کی بدولت انہوں نے نہ صرف یہ کہ مشرقی قوموں پر اپنی برتری قائم کی ہے بلکہ ان پر اپنا گہرا اثر بھی ڈالا ہے۔

ان مشرقی قوموں میں جنہوں نے مغرب کی مادی ترقیات کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا اور مغرب کے دریافت کردہ وسائل زندگی سے بھرپور فائدہ اٹھایا، جاپانی قوم سرفہرست ہے، بلکہ اب تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ مادی ترقیات، محیر العقول مصنوعات اور بہتر سے بہتر وسائل زندگی میں جاپان مغرب سے آنکھیں ملاتا نظر آتا ہے اور اگر زبان کا اختلاف نہ ہوتا اور شکل و صورت میں اتنا کھلا فرق محسوس نہ

ہو تا تو ٹوکیو جانے والے کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ ایک مشرقی ملک کے شہر "ٹوکیو" میں ہے یا امریکہ کے ایک ترقی یافتہ شہر "نیویارک" میں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ٹوکیو جانے والے کو مادی ترقی کے بعض ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جو لندن اور نیویارک جانے پر بھی اس کو نظر نہیں آتے تو غلط نہ ہو گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ یورپ نے جو مادی ترقی حاصل کی ہے اس ترقی نے انسانی زندگی کی ظاہری شکل بالکل بدل کر رکھ دی ہے، اور انسانی زندگی کو اس مقام تک پہنچادیا ہے جو عام انسانی خیال سے بالاتر ہے، لیکن افسوس کہ اس تہذیب نے زندگی کے انسانی، اخلاقی، روحانی اور بہتر خاندانی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

آج کی دنیا کا مہذب انسان اگرچہ پر تعیش زندگی گزارنے، مادی وسائل کو اپنے تابع بنالینے اور مادی طاقتوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لینے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن یہی انسان سائنسی و صنعتی میدان میں اتنی ترقی کر لینے کے باوجود اس خلا کو پر کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے جو خلا خود انسان اپنی ذات میں اور اپنی خاندانی و اجتماعی زندگی میں محسوس کر رہا ہے، اور یہ ایسا اہم مسئلہ ہے جو انسان اور انسانیت سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے غور طلب ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کی بھی فکر کی جائے جنہیں آج کی مشینی دنیا نے فراموش کر دیا ہے اور جن کے بغیر انسانی زندگی کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب دنیا میں کام کر رہے دینی، دعوتی، اصلاحی نظاموں کے پیغام اور ان کے طریقۂ کار کا غیر جانبدار ہو کر مطالعہ کیا جائے، اور اس میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ کون سے اجزاء ہیں جو انسان کے انسانی ضروریات پوری کرتے ہیں اور کس حد تک کرتے ہیں۔

اس مقصد کے پیش نظر "ٹوکیو" جیسے ترقی یافتہ شہر میں ایک ایسے اسلامک سینٹر کی ضرورت و اہمیت بڑھ جاتی ہے جو اس ملک کے باشندوں کو اسلام کی لائی ہوئی اخلاقی، روحانی اور انسانی قدروں سے واقف کرائے اور دوسری طرف دیگر مشرقی قوموں کو ان کوششوں سے آشنا کرے جو جاپانی قوم نے سائنس اور ٹکنالوجی سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں کی ہیں اور مادی دنیا میں ایک بلند مقام حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تاکہ ایک دوسرے کی بہتر دریافتوں سے فائدہ اٹھا سکے اور ایک دوسرے کی اچھائیوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔

جاپانی قوم اپنی پر سکون طبیعت، ٹھنڈے مزاج، علم میں یکسوئی اور عمل میں انہماک کی بدولت دوسری تمام قوموں سے ممتاز ہے، مقصد کی خاطر آرام و راحت کی قربانی دینے کے لیے وہ ہر وقت

تیار رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے صنعت کے مختلف میدانوں میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ مشرقی ممالک تو کجا بعض مغربی ممالک بھی جاپانی مصنوعات در آمد کرنے اور ان کا استعمال کرنے پر مجبور ہوگئے۔

جاپان مشرق و مغرب کے بالکل درمیان میں واقع ہے تو اگر اس نے اپنے دائیں طرف واقع مغرب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی تہذیب کو اختیار کرلیا ہے تو اپنے بائیں طرف واقع مشرق سے اتصال رکھنے کی وجہ سے اس کو وہ خصوصیات بھی اپنانی چاہئیں جو مشرقی قوموں کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں اور ان مشرقی قوموں میں سب سے نمایاں قوم مسلم قوم ہے جو بڑی حد تک تسلسل کے ساتھ ان چیزوں کی حفاظت کرتی چلی آرہی ہے جو انسانی زندگی کی ایسی تشکیل کرتی ہے کہ اس میں اخلاقی، روحانی ، اجتماعی اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی پوری نمائندگی ہے، اور انسانی زندگی میں اخلاقی و روحانی کمی نہیں پائی جاتی جو مغرب کی تمدنی زندگی میں پائی جاتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب اپنی سائنسی و صنعتی ترقی کے باوجود انسانی زندگی کے ان بنیادی مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کرسکی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں اخلاقی قدریں نظر انداز ہورہی ہیں۔ خاندانی بندھن نہایت کمزور ہوتے ہیں اور معاشرتی نظام غیر مربوط ہوگیا ہے، ایسی صورت حال میں جاپانی باشندوں اور اسلام کی نمائندگی کرنے والوں کے درمیان ربط پیدا کرنے اور ایک دوسرے سے متعارف کرانے کے لیے اسلامی مرکز کا قیام ایک قابل تعریف اور لائق ستائش اقدام ہے اور یہ کانفرنس جو عالمی اسلامی کانفرنس اور جاپان کے اسلامک سینٹر کے باہمی کوششوں کا نتیجہ ہے اس سلسلہ کی بہت اہم کڑی ہے۔

میں اس مرکز کے ذمہ داروں کو مبارکباد دیتا ہوں اور ان سے امید رکھتا ہوں کہ وہ جاپانی قوم کو ان تعلیمات سے واقف کرائیں گے جو ان کی اخلاقی، معاشرتی اور انسانی خصوصیات کی زندگی کو بہتر اور قلبی راحت کی زندگی میں تبدیل کرسکے گی۔

مشرقی ممالک کے اسلامی قدروں کے حامل اشخاص اور جاپانی قوم کے فکر مند حضرات کے درمیان گذشتہ صدی تک زیادہ وسیع تعلقات قائم نہیں ہوسکے تھے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس موجودہ صدی میں یہ تعلقات نیک جذبات کے ساتھ قائم ہونے لگے ہیں، اور ان کا دائرہ برابر بڑھتا جارہا ہے اور جاپانی قوم کی جانب سے ان تعلقات کو ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جارہا ہے۔

اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کو سامنے

رکھا اور دو نوں کے آداب اور اصول بتائے ہیں اور اجتماعی مسائل اور معاشرتی مشکلات کا حل بھی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ حضور پاک ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرنے، صحابہ کرام کی زندگیوں پر نظر ڈالنے اور تابعین عظام کے حالات کا جائزہ لینے سے معاشرتی مسائل کا اطمینان بخش اور راحت رساں حل سامنے آجاتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے انفرادی و اجتماعی زندگی کے جو اصول متعین کئے ہیں ان اصول کو اپنا کر آپ کے پیروکاروں نے زندگی کے ایسے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں جن کی روشنی میں انفرادی و اجتماعی زندگی کو آسودہ اور خوشگوار بنایا جاسکتا ہے۔

مغربی قوموں میں بڑھتی ہوئی مشکلات اور نت نئے ابھرتے مسائل کا اسلام نے جو حل پیش کیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس حل کو مشکلات سے دوچار مغربی تہذیب کے حاملین کے سامنے رکھا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مغربی تہذیب کے نمائندوں اور اسلامی فکر کے علمبرداروں کے درمیان روابط پیدا کئے جائیں، ملاقاتوں کا انتظام کیا جائے، موجودہ مسائل پر تبادلہ خیال کا اہتمام ہو اور مخلوط علمی و فکری سیمناروں کا انعقاد ہو تاکہ ایک دوسرے کے خیالات سننے اور مسائل سے واقف ہونے کا موقع مل سکے۔

قلبی سکون اور روحانی سعادت کے حصول کے لیے حضور پاک ﷺ سے جو رہنمائی ملتی ہے اس رہنمائی کے مطابق اگر زندگی گزاری جائے تو زندگی میں ایک بہار آسکتی ہے اور یہ دنیا جو باوجود راحت و ترقی کے اعلیٰ وسائل مہیا کر لینے کے قلبی راحت اور ذہنی سکون اور معاشرتی ہمدردی کے لحاظ سے جہنم بنتی جارہی ہے جنت کا ایک ٹکڑا بن سکتی ہے۔

حضور ﷺ نے انفرادی و اجتماعی زندگی کے یہ اصول صرف بتا کر نہیں بلکہ عمل کر کے دکھائے ہیں۔ آپ نے اپنے ہم وطنوں اور ساتھیوں کے ساتھ ایک مثالی زندگی گزاری، آپ نے زندگی کے نشیب بھی دیکھے اور فراز بھی، تلخ گھونٹ بھی پیے اور شیریں بھی، مشکلات کا سامنا بھی کیا اور بحرانوں سے گزرے بھی لیکن اپنی حکمت و دانائی، بلند ہمتی، نفس کی پاکیزگی اور خوش اخلاقی سے ان مشکلات پر قابو بھی پایا اور دنیا کے سامنے ان کا حل بھی پیش کیا۔

آپ نے شوہر کی حیثیت سے بھی زندگی گزاری اور باپ کی حیثیت سے بھی، دوستوں کی دوستی کا لطف بھی اٹھایا اور دشمنوں کی دشمنی کا سامنا بھی کیا، خاندان کی ذمہ داری بھی نبھائی اور جماعت کی قیادت کا فریضہ بھی انجام دیا، اس طرح آپ نے زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ کے لیے ایک نمونہ چھوڑا، اور یہی وہ نمونے ہیں جن کو اپنا کر موجودہ دور کے مسائل اور مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر اسحاق کی فارسی خدمات

بقلم ڈاکٹر محمد امین عامر
۱۰ اہلخانہ، دوسری گلی ہاوڑا۔ ۷۱۱۱۰۱ کلکتہ

آزادی سے چند سال قبل عہد فرنگی کے بنگال میں فارسی زبان و ادب کا چراغ گرچہ روشن تھا لیکن عوامی حیثیت سے فارسی اپنی مقبولیت کھوئی ہوئی نظر آرہی تھی۔ فارسی زبان و ادب سے عوام کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا اور فارسی فقط درس و تدریس کے طور پر کالجوں اور یونیورسٹی میں استعمال ہو رہی تھی۔ ادبی تخلیقات کا سفر بھی موقوف ہو چکا تھا اور شعراء و ادباء کی تعداد میں بھی خاصا کمی واقع ہو گئی تھی اور نتیجتاً فارسی زبان و ادب روبہ زوال ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس غیر یقینی اور تشویشناک صورت حال کے پیش نظر کلکتہ جیسی انقلابی، تاریخی، علمی اور ادبی سرزمین سے بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں ایک ایسی مایہ ناز شخصیت جنم لیتی ہے جس کی پیدائش پر بنگال صدیوں فخر کرتا رہے گا۔ وہ بے مثال اور لائق صد فخر شخصیت ڈاکٹر محمد اسحاق بانی ایران سوسائٹی کلکتہ کی ذات گرامی تھی، جنہوں نے مصائب و آلام اور سخت مایوسی کے عالم میں فارسی زبان وادب کی دستگیری کی اسے سینہ سے لگایا اور ایک مشفق اور مہربان باپ کی طرح اس کی اس طرح پرورش و پرداخت کی کہ وہ دوبارہ جوان و توانا ہو کر حالات زمانہ سے آنکھیں ملانے کے قابل بن گئی۔

ڈاکٹر محمد اسحاق کی پیدائش کلکتہ میں یکم نومبر ۱۸۹۸ء کو ہوئی۔ علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد ۱۹۲۳ء میں انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے امتیازی نمبرات کے ساتھ عربی ادب میں ایم اے کیا پھر ڈھاکہ یونیورسٹی اور مولانا آزاد کالج کلکتہ کو چند سالوں تک اپنی خدمات سے نوازنے کے بعد مستقل طور پر ۱۹۶۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک رہ کر اسے اپنی علمی، ادبی اور تدریسی خدمات پیش کیں۔ ان کا میدان گرچہ عربی زبان وادب تھا مگر فارسی زبان وادب کے محقق اور

اسکالر کی حیثیت سے انہیں ملک اور بیرون ملک میں ایسی شہرت عطا ہوئی کہ اس زمان کے علماء فضلاء اور دانشوروں نے ان کی بے پناہ علمی استعداد اور لیاقت کی بناپر انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور فارسی زبان وادب کی پیش رفت سے متعلق ان کی گرانقدر خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور ان کی خوب پذیرائی اور تعریف و توصیف کی۔

ڈاکٹر اسحاق نے تقریباً ۴۰ سال تک اپنے کو درس و تدریس میں مشغول رکھ کر فارسی زبان وادب کی بے مثال خدمت انجام دی۔ شاگردان فارسی کو بڑی شفقت اور محبت سے نہ صرف یہ کہ تعلیم دیتے بلکہ ان کے دیگر مسائل اور مشکلات سے بھی غیر معمولی دلچسپی رکھتے اور ان کے بہت کام آتے۔ اس راہ میں انہوں نے ایسی جدوجہد کی اور ایسے قابل قدر اور لائق فخر فارسی زبان وادب کے خوشہ چینوں کو پیدا کیا کہ جن کی بدولت ڈاکٹر اسحاق زندہ وجاوید رہیں گے۔ ان قابل تلامذہ میں کلکتہ یونیورسٹی کے سر آسوتوش پروفیسر ڈاکٹر عطا کریم برقؔ (متوفی:۱۹۹۹ء) کا نام نمایاں ہے جو اپنے استاد ہی کی طرح فارسی زبان وادب کے معروف اسکالر کی حیثیت سے منصۂ شہود پر ابھرے اور تاریخ میں اپنا نام ثبت کر گئے۔

دوران ہی سے ڈاکٹر اسحاق کو فارسی زبان وادب سے بڑا گہرا شغف پیدا ہو چکا تھا۔ اس زبان کی تاریخ و ثقافت میں تحقیق و مطالعہ کی خاطر ۱۹۳۰ء میں انہوں نے تہران کا رخ کیا اور وہاں دوران قیام فارسی زبان وادب کے اساتذہ اور دانشوروں سے ربط و تعلق پیدا کر کے ان کے تعاون سے علمی مواد فراہم کیا۔ ایرانی علماء و فضلاء نے فارسی سے ان کے گہرے لگاؤ، اشتیاق اور غیر معمولی استعداد وصلاحیت کو دیکھ کر ان کی جس درجہ پذیرائی کی یہ ان کے علم و فضل کو خراج عقیدت پیش کرنے کے مترادف ہے۔ فارسی زبان وادب میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کی حصولیابی کی غرض سے ڈاکٹر اسحاق نے ۱۹۳۸ء میں لندن کا سفر کیا اور وہاں "جدید فارسی شاعری" کے موضوع پر گرانقدر تحقیقی کام کر کے ۱۹۴۰ء میں لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد وہ سوئزرلینڈ، فرانس اور اٹلی وغیرہ کا کامیاب دورہ کر کے ہندوستان واپس آگئے۔ ڈاکٹر اسحاق کا یہ تحقیقی مقالہ مطبوعہ شکل میں ان کی فارسی خدمات کا ایک قابل یادگار نمونہ ہے۔

ڈاکٹر اسحاق حکومت ایران کی دعوت پر دوبارہ ۱۹۳۴ء میں ایران گئے اور وہاں مقام طوس میں منعقدہ جشن ہزارۂ فردوسی میں شرکت کی اور ایسا زبردست علمی اور پر مغز خطبہ پیش کیا کہ

اہل زبان نے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔ ان کا یہ خطبہ اس موقع پر شائع ہونے والے ایرانی جملہ میں محفوظ ہے۔ حکومت ایران کی جانب سے ۱۹۶۶ء میں وہ تیسری بار ایران گئے اور تہران میں منعقدہ ایرانشناسوں کے ایک عالمی اجتماع کو "ہند وایران کے تعلقات" کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس طرح ایران کے عالمی اجتماعات میں ان کے دو مذکورہ گرانقدر خطبات بڑی علمی اہمیت کے حامل ہیں جو فارسی زبان وادب کے مطالعہ اور تحقیق کے ضمن میں ڈاکٹر موصوف کی خدمات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کی انہیں خدمات کی بدولت ۱۹۵۹ء میں انہیں "طلائی تمغہ" عطا کیا گیا اور اس کے بعد حکومت ایران کی جانب سے ہند وایران کے مابین دوستی اور ثقافتی امور کو فروغ دینے کی خاطر انہیں "تمغہ شاہی" سے نوازا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے انہیں سر عبداللہ سہروردی لکچر کے لیے منتخب کیا جس کے تحت انہوں نے "فارسی حروف تہجی" کے عنوان پر تین دنوں تک نہایت ہی معلومات اور تحقیقاتی مقالہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی اور ملک وبیرون ملک کے علمی، ادبی، اداروں اور درسگاہوں کے تحت ہونے والے مذاکرات میں بھی وہ اکثر وبیشتر شرکت کرتے رہے اور اپنے گرانقدر تحقیقی اور علمی مقالات سے فارسی زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام دے کر دانشویان فارسی کی تشنگی بجھاتے رہے۔ ان کی زندگی فارسی زبان وادب کے مطالعہ اور ترویج واشاعت کی خاطر وقف تھی۔ وہ فارسی کے اس قدر دیوانہ، عاشق اور شیفتہ تھے کہ انہیں اس زبان کو زندہ رکھنے اور اسے پروان چڑھانے کی فکر نے ۱۹۴۴ء میں اہل کلکتہ کو "ایران سوسائٹی" کی شکل میں فارسی زبان وادب کا ایک ایسا یادگار اور انمول تحفہ عطا کیا جو ان کے خوابوں کی تعبیر مسلسل جد وجہد اور مقصد کا محور اور مرکز ہے۔ فارسی زبان وادب اور تاریخ و ثقافت کی یہ انجمن جو بلاشبہ ڈاکٹر اسحاق کی زندگی کا عظیم کارنامہ ہے آج اپنی بیش بہا کارگذاریوں کے سبب ہندوستانی سرحدوں کو عبور کر کے دیار غیر میں بھی اپنا ایک علمی اور ادبی معیار بنا چکی ہے۔ ارباب علم وادب جس طرح ماضی میں اس انجمن سے مستفیض ہوتے رہے ہیں آج بھی اسے اپنی علمی اور ادبی حصول کا مستقر بنائے ہوئے ہیں۔ یہ ڈاکٹر اسحاق ہی کی عالمانہ شخصیت اور فارسی خدمات کا فیضان ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے علماء، فضلاء اور دانشوروں میں سے نیشنل پروفیسر آف انڈیا، پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی، برصغیر کے عظیم مؤرخ اور اسکالر مولانا سید صباح

الدین عبدالرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، آقای وحید دستگردی، حبیب یغمائی اور سعید نفیس وغیرہ نے ڈاکٹر موصوف کی فارسی خدمات کو سراہا اور انہیں خراج تحسین پیش کیا۔

ڈاکٹر اسحاق نے اپنی حیات میں دنیا کے دو مشہور حکیم اور فلسفی البیرونی اور بوعلی سینا کی زندگی اور ان کے یادگار کارناموں پر مشتمل نہایت ہی تزک واحتشام کے ساتھ بالترتیب ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۶ء میں ہزار سالہ جشن، ایران سوسائٹی کلکتہ میں منعقد کیا۔ اس کے علاوہ چار سو سالہ جشن ملاصدرا اور صد سالہ جشن پروفیسر ای۔ جی براؤن بھی ڈاکٹر موصوف کی فارسی خدمات کے مظہر ہیں جن سے یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ ڈاکٹر اسحاق نے فارسی زبان وادب کے مطالعہ اور اس کی ترویج واشاعت کی خاطر علمی مذاکرات اور جشن کے انعقادی طریقوں سے بھی کام لیا جس میں ان کی غیر معمولی دلچسپیوں اور مساعی کو بڑا دخل رہا ہے۔ ایران سوسائٹی آج بھی علمی مذاکرات، سمینار اور سمپوزیم کے ذریعہ فارسی خدمات کا نہ صرف یہ کہ بیڑا اٹھائے ہوئے ہے بلکہ اپنے بانی کی روش پر گامزن رہتے ہوئے انہیں برابر خراجِ عقیدت بھی پیش کرتی رہی ہے۔

سمینار اور سمپوزیم کے علاوہ فارسی زبان وادب اور تاریخ وثقافت پر مشتمل درجنوں بیش بہا کتابوں کی اشاعت نیز فارسی اور انگریزی زبانوں پر مشتمل سہ ماہی مجلہ انڈوایرانیکا (INDO-IRANICA) کا اجراء ڈاکٹر اسحاق کی فارسی خدمات سے مربوط ہے۔ تقریباً ۲۵ رسال تک یہ علمی، تاریخی اور یادگار مجلہ بیش بہا معلومات کا خزینہ لیے ہوئے ان کی ادارت میں نکلتا رہا اور ان کے بعد سے اب تک پابندی کے ساتھ اس کی پچاسویں جلدیں علمی اور ادبی حلقوں کو سیراب کرچکی ہیں۔ ان میں کچھ خصوصی نمبرات پر مشتمل علماء، ادباء، حکماء اور شعراء کے آثار سے بحث کرتی ہیں اور چندے معدودے میں ڈاکٹر اسحاق کی گراں قدر علمی اور ادبی نگارشات شامل ہیں جو فارسی زبان وادب کے ضمن میں بطور خدمات ان کے عطایا ہیں۔ ان کے زیادہ تر مضامین بزبان انگریزی درج ذیل ہیں:

۱۔ ایران کا قدیم اسلامی ادب۔ قدیم فارسی، اوستا اور پہلوی

۲۔ مرزا احمد تقی بہار ۳۔ رودکی سمرقندی

۴۔ رابعہ قزداری ۵۔ پروین اعتصامی

۶۔ کسائی مروزی ۷۔ مہستی گنجوی

۸۔ قدیم ایران کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر

۹۔ راجہ رام موہن رائے کی زندگی اور کارنامے (بزبان فارسی)

۱۰۔ شہید بلخی ۱۱۔ درویشوں کے بادشاہ۔ شاہ نعمت اللہ

۱۲۔ تعلیم۔ جدید ایران میں ۱۳۔ ای۔ جی۔ براؤن کی زندگی اور کارنامے

۱۴۔ دقیقی طوسی ۱۵۔ حنظلہ بادغیسی وغیرہ۔

اس کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبان میں دیگر قیمتی نگارشات بھی ملک اور بیرون ملک کے علمی اور ادبی رسالوں کی زینت بن چکی ہیں۔

ایران سوسائٹی میں جدید فارسی کلاس کا اہتمام، محصلان فارسی کے لیے وظائف کا بندوبست نیز زبان و ادب اور تاریخ و ثقافت کے موضوع پر ہزاروں نادر اور نایاب کتابوں سے معمور لائبریری کا قیام، جس میں خود ڈاکٹر اسحاق کی ذاتی تین ہزار کتابوں کا عطیہ شامل ہے، انکی فارسی خدمات کا بین ثبوت ہے۔ یہ وضاحت بھی ناگزیر ہے کہ ڈاکٹر اسحاق نے فقط فارسی کتابوں کی اشاعت کی خاطر اپنے ذاتی پانچ سو روپئے کے عطیہ سے یکم فروری ۱۹۴۸ء کو "ڈاکٹر ایم اسحاق میموریل فنڈ" کا قیام عمل میں لایا جس کے ذریعہ موصوف کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ اسی فنڈ سے شروع کیا گیا۔ ڈاکٹر موصوف کا یہ گرانقدر مالی تعاون بھی فارسی زبان و ادب کا مطالعہ اور ترویج و اشاعت میں ان کی ناقابل فراموش خدمت سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ انکی علمی، ادبی اور تاریخی تصنیفات درج ذیل ہیں:

۱۔ سخنوران ایران در عصر حاضر (فارسی) دو جلد

۲۔ جدید فارسی شاعری (انگریزی)

۳۔ ایران کی چار شاعرات (انگریزی)

روضۃ الجنات اور ہفت اقلیم بالترتیب معین الدین اور امین احمد رازی کی تصنیفات ہیں جسے انہوں نے نہایت ہی تحقیق و جستجو اور عرق ریزی سے ایڈٹ کر کے شائع کر دلیا۔ اس کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی کے عربی مخطوطات کی فہرست بھی انھوں نے مرتب کی جو بہت ہی اہم اور

عالمانہ ہے۔ انکی تصنیفات میں سے 'سخنوران ایران در عصر حاضر، کو ہند وایران میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور آج بھی وہ ملک اور بیرون ملک کے کالجوں اور یونیورسٹیز میں داخل نصاب ہے۔ اس کتاب کی تالیف سے متعلق ہندوستان کے معروف تاریخ داں اور فارسی دانشور پروفیسر سید حسن عسکری نے اپنے جن گرانقدر خیالات کا اظہار کیا ہے وہ لائق تذکر ہے۔ پروفیسر موصوف رقمطراز ہیں:

IT WAS A GREAT BOON FOR THE PERSIAN STUDENTS BECAUSE IN THESE DAYS THERE WERE VERY FEW SOURCES OF OUR INFORMATION REGARDING MODREN PERSIAN POETS .IN FACT THERE WAS ONLY ONE BOOK OF THIS TYPE, NAMELY"سخنوران دوران پہلوی"LEY DINRHAH IRANI.BUT DR.ISHHAQ,S WORK WAS VERY MUCH SUPERIOR TO IRANI,S AS THE "سخنوران ایران در عصر حاضر"GAVE IN DETAIL AUTH ENTIC AND FIRST HAND INFORM ATION ABOUT MODERN PERSIAN POETS AND AUTHORS"

اس کتاب کی تصنیف پر حکومت ایران نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں "نشان علمی" کے نام سے ایک میڈل تفویض کیا۔

ڈاکٹر اسحاق، ایوان سوسائٹی کے علاوہ ملک کی دیگر انجمنوں اور دانشگاہوں سے بھی محض فارسی زبان وادب کی خدمت کی خاطر وابستہ رہے اور ایک طویل عرصہ تک اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیکر ۱۲ر ستمبر ۱۹۶۹ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اب تک ان کی حیات اور کارناموں پر مشتمل کوئی مستقل تصنیف زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی۔ امید ہے ایران سوسائٹی کلکتہ کے ارباب حل عقد اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

قومی اقلیتی، ترقیاتی ومالیاتی کارپوریشن مقاصد اور عزم وارادوں کے آئینہ میں

قاری محمد میاں مظہری
(چیئرمین: قومی اقلیتی ترقیاتی مالیاتی کارپوریشن)

حکومت ہند کی جانب سے قومی اقلیتی ترقیاتی اور مالیاتی کارپوریشن کا قیام تسلیم شدہ اقلیتوں کی اقتصادی ترقی کو بڑھاوا دینے کے لیے کیا گیا ہے جس میں مسلمان، عیسائی، سکھ، بودھ اور پارسی شامل ہیں۔ یہ کارپوریشن سرکاری ادارہ ہے۔ اسے ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء کو کمپنی ایکٹ کی دفعہ ۲۵ کے تحت غیر منافع بخش کمپنی کے طور پر کارپوریشن بنایا گیا۔ کارپوریشن کے مقاصد اور نشانے مندرجہ ذیل ہیں:

☆ اس کا اہم مقصد پسماندہ طبقے کے اقلیتی طبقوں کی بھلائی کے لیے اقتصادی اور ترقیاتی سرگرمیوں کو ترغیب دینا ہے جس میں تجارت پیشہ گروپ کی عورتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ وقتاً فوقتاً حکومت کی جانب سے مقررہ آمدنی اور اقتصادی کسوٹیوں کی بنیاد پر اقلیتی طبقے کے افراد یا افراد کے گروپ کو مالی اور اقتصادی اسکیموں اور منصوبوں کے لیے قرض اور ایڈوانس دیا جاتا ہے۔

☆ اقلیتی کے فائدے کے لیے خود روزگاری اور دیگر کاموں کو بڑھاوا دینا۔

☆ وقتاً فوقتاً حکومت ہند یا ریزرو بینک کی جانب سے مقررہ حکم یا منصوبے کے تحت طے شدہ شرح سود پر قرض یا پیشگی دینا۔

☆ اقلیتی فرقہ کے اہل افراد کو عام کاروباری تکنیک یا گریجویشن اور اعلیٰ تعلیم کے لیے قرض اور پیشگی رقم مہیا کرائی جاتی ہے۔

☆ پیداواری یونٹوں کے مکمل اور بہتر انتظام کے لیے اقلیتوں کی تکنیکی اور صنعتی مہارت کو

فروغ دینے کے لیے امداد دینا۔

☆ اقلیتوں کی ترقی کے لیے کام کرنے والی ریاستی سطح کی تنظیموں کو مالی امداد یا کویٹی الاٹمنٹ فراہم کرانے میں اور دوبارہ مالیہ کے توسط سے کاروباری فنڈ کے حصول میں امداد دینا۔

☆ سب سے بڑے ادارے کے طور پر کام کرتے ہوئے ریاستی حکومت مرکز کے زیر انتظام حکومت کی جانب سے قائم تمام کارپوریشنوں، سرکل اور دیگر تنظیموں سے اشتراک اور جانچ مانیٹرنگ کرنا یا اقلیتوں کی اقتصادی ترقی کے لیے تعاون کی ذمہ داری دینا اور۔

☆ اقلیتوں کی ترقی کے لیے سرکاری پالیسیوں اور پروگراموں کو بڑھانے میں مدد دینا۔

۲۔اجتماعی نشانہ

این ایم ڈی ایف سی کے اجتمائی ہدف میں سیدھا فائدہ ان اشخاص کو ملے گا جو اقلیتی فرقے اور خط افلاس سے بھی نیچے درجہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ موجودہ حالات میں قومی اقلیتی کمیشن کے قانون ۱۹۹۲ء کے مطابق یہ طبقے ہیں۔ مسلمان، عیسائی، سکھ، بودھ اور پارسی۔ایسے خاندان کی آمدنی گاؤں میں ہر سال ۳۲ ہزار روپے سے اور شہر میں ۴۲ ہزار روپے سے کم ہو اور جسے خط افلاس سے نیچے درجہ بند کیا گیا ہو۔

۳۔این ایم ڈی ایف سی کی مالی تقسیم

کارپوریشن کے اختیار میں شیئر رقم پانچ سو کروڑ روپے ہے۔ حکومت ہند کا مالی حصہ ۶۰ فیصدی تین سو کروڑ روپے ہے جبکہ مرکزی سرکار کے زیر انتظام صوبے کی حکومتوں سے مالی حصہ ۲۶ فیصد ایک سو تیس کروڑ روپے سے کم نہیں ہونا چاہیے۔باقی ۱۴ فیصد ۷۰ کروڑ روپے مالی حصہ اقلیتی فرقے میں دلچسپی رکھنے والے اداروں اور افراد کے ذریعہ حاصل کیا جائے گا۔

۴۔مالی امدادی منصوبہ

این ایم ڈی ایف سی کے پاس اپنے آخری ضرورت مندوں تک پہنچنے کے دو راستے ہیں: ایک ہے ریاستی چینلائزنگ ایجنسی کے توسط سے (ایس سی اے) جنہیں متعلقہ ریاست مرکز کے زیر انتظام حکومت کے ذریعہ نامزد کیا گیا ہو۔اور دوسرا غیر سرکاری اداروں (این جی او) کے ذریعے سے۔ان دو پروگراموں کے تحت قرضہ جاتی منصوبوں کی تفصیل اس طرح ہے:

(الف)ایس سی اے پروگرام کے تحت:

ا۔معیادی قرضہ جات کا منصوبہ

معیادی قرضہ جات منصوبہ کے تحت پانچ لاکھ روپے تک کی اسکیم کی لاگت پر غور کیا جاسکتا ہے۔این ایم ڈی ایف سی کے ذریعہ اسکیم لاگت کا ۸۵ فیصدی جو زیادہ سے زیادہ ۴۲۵۰۰۰ روپے کا قرض مہیا کرایا جاتا ہے۔باقی اسکیم پر لاگت رقم ایس سی اے اور ضرورت مند شخص کے ذریعے دی جاتی ہے۔یعنی کہ ضرورت مند کو اسکیم کی لاگت کی کم سے کم پانچ فیصدی رقم دینی ہوتی ہے۔

معیادی قرضہ جات اسکیم کا سود دراس طرح ہے:

قرض کی حد	سود کی در
۲ لاکھ روپے تک	۷ فیصد
۲ لاکھ روپے سے اوپر	۱۰ فیصد

معیادی قرض اسکیم کے تحت تکنیکی کاروباری کاموں کے لیے قرض دیا جاتا ہے۔جسے مندرجہ ذیل حصوں میں درجہ بند کیا گیا ہے:

۱	زراعت اور اس سے متعلق
۲	تکنیکی بیوپار
۳	چھوٹے بیوپار
۴	دستکار اور روایتی کاروبار
۵	نقل وحمل اور دیگر خدمات

اپنا روزگار اسکیم گروپ کے تحت اس سے متعلق حصے کی تفصیلی فہرست دفتر ہذا میں دستیاب ہے۔فہرست تفصیلی ہے اور یہ نمونے کے طور پر ہے۔

۲۔مارجن امدادی رقم

بینک سے مالی امداد حاصل کرنے والے ضرورت مندوں کو مارجن امدادی رقم مہیا کرائی جاتی ہے۔عموماً عوامی سیکٹر کے بینک اسکیم لاگت کے ۶۰ فیصد تک رقم دیتے ہیں۔اور ۴۰ فیصد

مارجن امدادی رقم کے تحت بینک کے ذریعہ مانگی گئی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے این ایم ڈی ایف سی جائز ضرورت مندوں کو قرضہ مہیا کرتا ہے۔اس کے لیے فی یونٹ اسکیم لاگت کا ۲۵ فیصدی ہے جو زیادہ سے زیادہ ۲۵.۱ لاکھ روپے تک ہے باقی رقم ایس سی اے اور ضرورت مند کی جانب سے دیئے جانے کی امید کی جاتی ہے۔

حال میں بینک سے قرضہ حاصل کرنے والے ضرورت مندوں کو بروقت امداد مہیا کرانے کے لیے این ایم ڈی ایف سی کے ذریعے مارجن امدادی رقم کے تحت دوبارہ ادائیگی کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

قرض کی حد	سود کی در
۴۰۰۰۰ روپے تک	۳ فیصد
۴۰۰۰۰ روپے سے ۱۲۵۰۰۰ روپے تک	۴ فیصد

(ب) غیر سرکاری تنظیم پروگرام کے تحت:

این ایم ڈی ایف سی کی جانب سے حال ہی میں بنگلہ دیش کے گرامین بینک اور ہمارے دیش میں N.A.B.A.R.D اور وزارت انسانی وسائل کے خواتین واطفال کی فلاح و بہبود کے شعبے کے تحت قومی خواتین فنڈ کے پیٹرن پر مالی پرداخت اسکیم (مائکرو فنائنسنگ اسکیم) کو شروع کیا گیا ہے۔یہ اسکیم منتخب اصلی منظور شدہ این جی او اور خود امدادی گروپوں کے نیٹ ورک کے ذریعہ سے غریبوں میں غریب لوگوں کو محدود امداد مہیا کراتی ہے۔یہ ایک غیر رسمی قرضہ اسکیم ہے جو ضرورت مندوں کو مسلسل پیروی کے ساتھ ان کے گھر تک قرضہ پہنچانے کے کام کو یقینی بناتی ہے۔اس میں ضرورت مند کو پہلے خود امدادی گروپوں کی تشکیل کرنا اور بہتر مسلسل بچت کی عادت بنانا، چاہے وہ چھوٹی ہی ہو اولین شرط ہے۔اسکیم کے تحت قلیل مدت کے لیے زیادہ سے زیادہ ۶۰۰۰ ہزار روپے فی ضرورت مند اور درمیانی مدت کے لیے زیادہ سے زیادہ ۱۰۰۰۰ ہزار روپے فی ضرورت مند مہیا کرلیا جاتا ہے۔این جی او کو یہ رقم ۸ فیصدی کی در پر جسے وہ آگے ضرورت مند کو ۱۲ فیصد کی در پر مہیا کرائی جاتی ہے۔ قلیل مدت کے لیے ادائیگی کی مدت ۲ سے ۵

سال ہے۔

۴۔ خود امدادی گروپوں کی ترقی کے لیے بلاسودی قرض

این جی او کو خود امدادی گروپوں (ایس ایچ جی) کی ترقی کے لیے بلاسودی قرضہ جات کے طور پر مالی امداد مہیا کرائی جاتی ہے۔ ۱۰۰۰ ممبران کے ۵۰ ایس ایچ جی کی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم ۱۵.۴ لاکھ روپے کا قرضہ مہیا کرایا جاتا ہے۔ قرضے کو ایک سال بعد لوٹایا جائے گا اور ایس ایچ جی کے ذریعہ لیا گیا ۲۵ فیصدی قرضہ پیشگی در پر بطور عطیہ شامل کیا جائے گا۔ اور ۵ فیصدی ان کے بچت کے اضافے پر (جو پچھلے سال کی بچت کے اضافے کا ۱۰ فیصد ہو)

۵۔ مالی امداد حاصل کرنے کا طریقۂ کار

(الف) ایس سی اے اس پروگرام کے تحت این ایم ڈی ایف سی سے قرض حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ضرورت مند حضرات کو اپنی ریاستی سرکار کی چینلائزنگ ایجنسی میں درخواست دینی ہوگی۔ جس کا پتہ ہر ریاست کی راجدھانی سے مل سکتا ہے۔

عموماً ہر چینلائزنگ کے پاس ضلعی سطح کا دفتر ہے۔ اس بارے میں مزید معلومات ضلع مجسٹریٹ / اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس لیے ایس سی اے کے ضلعی سطح کے دفتر میں ہی درخواست دینا مناسب ہوگا۔ ضرورت مندوں کا انتخاب ضلعی سطح کی کمیٹی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ منتخب کئے ہوئے ضرورت مندوں کو قرض اقرارنامہ ڈیڈ مورٹ گیج ڈیڈ کو مکمل کرنا ہوگا۔ ان رسمیات کے پورا ہونے پر ضرورت مندوں کو قرضہ یا تو سیدھے ایس سی اے کے ذریعے سے یا مقامی دفتر سے مہیا کرایا جائے گا۔

(ب) این جی او پروگرام کے تحت جو این جی او خود امدادی گروپوں کی ترقی کے لیے این ایم ڈی ایف سی کی قلیل مالی پرورش اسکیم یا بلاسودی قرضے کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں انھیں این ایم ڈی ایف سی سے ملنے والے مقررہ درخواست فارم میں اپنی تجویز جمع کرانی ہوگی۔ ایسے معاملے میں جہاں این جی او، این ایم ڈی ایف سی سے قرضہ حاصل کرنے کے اہل اور مناسب پائے جائیں گے تو ضرورت پڑنے پر این جی او کے ریکارڈ اور سرگرمیوں کی تصدیق کے لیے این ایم ڈی ایف سی کے

افسران کے ذریعے این جی او کا دورہ کیا جائے گا۔ درست اور بونافائڈ پانے پر این جی او کو مالی امداد کی تفصیلی شرطوں کے ساتھ منظور نامہ جاری کیا جائے گا۔ منظوری کے مطابق این جی او کو رقم حاصل کرنے کے لیے این ایم ڈی ایف سی کے پاس آنا ہوگا۔

۶۔ این ایم ڈی ایف سی کی دیگر سرگرمیاں

(الف) پیشہ ورانہ ٹریننگ اقلیتی فرقہ کے لوگوں کو ان کے خصوصی کاروبار میں ان کی مہارت اور ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے اور تجارت میں اہلیت اور روزگار مزدوری کے ساتھ ساتھ روزگار کے لیے این ایم ڈی ایف سی کی جانب سے پیشہ ورانہ ٹریننگ اسکیم کی ابتداء کی گئی ہے۔ اس منصوبے پر عمل آوری ریاست کی چینلائزنگ ایجنسی کے توسط سے کی جاتی ہے۔ منصوبے کے تحت مقامی ٹریننگ اداروں کی مدد سے ریاستوں میں ایس سی اے کی جانب سے ضرورت کے مطابق پیشہ ورانہ ٹریننگ پروگرام کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان پروگراموں کی مدت ۶ ماہ سے ایک سال تک ہوتی ہے۔ امداد کے طور پر ٹریننگ لاگت کا ۸۵ فیصد خرچ ایس سی اے کی جانب سے اٹھایا جاتا ہے۔ ایس سی اے سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ منظور رقم کی تائید کے لیے مقررہ پر فارموں میں اپنی تجویز این ایم ڈی ایف سی کو بھیجے۔

(ب) دستکاری کی مدد کے لیے مارکیٹنگ

دستکاروں کو بازار میں بڑھاوا دینے اور ان کی مصنوعات کی فروختگی میں مناسب قیمت ملے اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے این ایم ڈی ایف سی، ایس سی او کے ساتھ ساتھ این جی او کی جانب سے منتخبہ مقامات کی نمائشوں میں اقلیتی دستکاروں کے ہینڈ لوم دستکاری کی پیداوار کی نمائش اور فروختگی کی جاتی ہے۔ اس قسم کی نمائشوں سے خریدار اور فروخت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع مل جاتا ہے جو پیداوار کے فروغ اور ایکسپورٹروں کے ساتھ ساتھ ملک میں کھپت کے لیے بازار کے فروغ میں بہت اہم ہے۔ تجاویز کی مناسب قیمت مقرر ہونے کے بعد این ایم ڈی ایف سی تنظیموں کو نمائش کے انعقاد کے لیے امداد فراہم کرتی ہے۔

(ج) مہارت بڑھانے / ڈیزائن کے فروغ کے لیے امداد

تیزی سے بدلتی دنیا میں لوگوں کو علم، پسند اور دلچسپیوں میں تیزی سے تبدیلی آرہی ہے۔ اس لیے دستکاروں کے ذریعہ بنائے گئے ہینڈلوم اور دیگر اشیاء کے ڈیزائن اور خوبصورتی میں جدت ہو قیمتوں میں مقابلہ ہونا چاہئے۔ نئے ڈیزائن اور ٹریننگ کی جدید ترین جانکاری دستکاروں کو دینا ضروری ہے۔ جس سے انکی مہارت کو بڑھاوا ملے اور وہ ان چیلنجوں کا سامنا کر سکیں۔ اقلیتی فرقہ کے دستکاروں کے لیے ایس سی او کے ساتھ ساتھ این جی او کے ذریعہ ڈیزائن میں مہارت بڑھانے کی ٹریننگ پروگراموں کے انعقاد کی تجویزوں کا این ایم ڈی ایف سی خیر مقدم کرتی ہے۔ تجویزوں کی خوبی کی بنیاد پر قیمت مقرر کرنے کے بعد این ایم ڈی ایف سی ایسے پروگرام کے انعقاد کے لیے امداد فراہم کرتی ہے۔

۷۔ کامیابی

(الف) ۳۱/۳/۲۰۰۰ء تک ایس سی اے پروگراموں کے تحت این ایم ڈی ایف سی کے ذریعہ ۲۱ ریاستوں میں پھیلے ۶۶۸۹۱ افراد کو فائدہ اور ایک مرکز کے زیر انتظام ریاست کو ۲۲۴.۳۴ کروڑ روپے کی مالی امداد دی گئی۔

(ب) این ایم ڈی ایف سی کے ذریعہ سال ۹۹-۱۹۹۸ء سے این جی او کے پروگراموں کو عمل میں لایا جارہا ہے اور مارچ ۹۹ تک پہلے سال کے دوران نو این جی او کے ۹۴۸ افراد کو قلیل مالی امداد کے لیے ۳۸.۳۷ لاکھ روپے دیئے گئے۔ اس کے علاوہ ۷ این جی او کو خود امدادی گروپوں کے فروغ اور مستقل کرنے کے لیے ۴.۹۰ لاکھ روپے کا بلاسودی قرض دیا گیا۔

۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے دوران ۱۰۰۰ ضرورت مندوں کے لیے ۱۹ این جی او کو ۳۸.۵۶ لاکھ روپے دیئے گئے اس کے علاوہ ۱۲ این جی او کو خود امدادی گروپوں کے فروغ اور مستقل کرنے کے لیے ۲۵.۱۴ لاکھ روپے کا بلاسودی قرض دیا گیا۔

☆☆☆

☆☆

☆

R.N.I. REGN. NO. 965/57 Price Single Copy .Rs 10/= JUL.AUG. 2000

BURHAN (Monthly)

Edited by: Amidur Rehman Usmani

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid Delhi-110006 : 3262815-3241196